قرآن اور زندگی

پروفیسر کرّار حسین

قرآن اور زندگی

پروفیسر کرّار حسین

اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
ایس ٹی بی بلاک ۶ فیڈرل بی ایریا کراچی

پیش لفظ

خوانندگانِ محترم!

آپ کے پیشِ نظر چند مضامین کا مجموعہ ہے،

مضامین زندگی کے مختلف انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں اور اپنے زمانے کے ملکی اور ملّی مسئلوں سے متعلق ہیں۔

ان مضامین کی دین، ملّت، اخلاق، رسوم، علم و حکمت اور عقیدت کے عنوانات کے تحت تقسیم کی گئی ہے۔

موضوعات کو کلامِ پاک کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلامِ پاک وہ پاک کلمہ ہے جس کی تمثیل ایک پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑ بہت مضبوط اور قائم ہے، جس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو اذنِ الٰہی سے ہر زمانہ اور ہر دَور میں بارآور ہوتا ہے۔

کلامِ پاک ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو تمام زمانوں پر محیط ہے اور ہر زمانے کے لئے ہدایت (نور) اور معیار (فرقان) ہے۔

اِن میں سے اکثر مضامین ریڈیو پاکستان پر نشر کئے جا چکے ہیں۔ اب ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اِس حُسنِ ظن کے ساتھ کہ شاید زندگی کے کچھ مسئلوں کو اس نور کی ایک جھلک میں

دیکھنے اور زندگی کی چند قدروں کو اِس فرقان کی محک پر آزمانے کی کوشش میں کسی حد تک کامیابی حاصل ہو گئی ہو۔

اور اس یقین کے ساتھ کہ اس حقیر کوشش کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے وقت کا ضیاع نہ ہو گا جو فہم و تفکّر کو انسانی زندگی کا اوّلین فریضہ اور حکمت کو انسانی زندگی کے لئے خیرِ اعلیٰ ہونے میں یقین رکھتے ہیں۔

خدا ہمارے اور آپ کے ساتھ ہو۔

خیر اندیش

کرّار حسین

خراسان اِسلامک ریسرچ سینٹر

کراچی

۷ر جولائی ۱۹۷۹ء

ترتیب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	دین	۷
۱	توحید	۹
۲	دین کی جامعیت	۱۳
۳	مومن کی زندگی	۱۷
۴	مقامِ شہادت	۲۱
۵	حق اور باطل کا قرآنی تصوّر	۲۷
۶	نفع اور ضرر اللہ کے اختیار میں ہے۔	۳۱
۷	دین میں فرقہ بازی	۳۵
۸	دَورِ حاضر میں مذہب سے بیگانگی	۴۰
	ملّت	۴۵
۱	اتحاد اور یک جہتی	۴۷
۲	ملّت کا استحکام	۵۱
۳	تعمیر و ترقی	۵۶
۴	دولت کا ارتکاز	۶۲
۵	معاشرتی ترقی	۶۶
۶	دفاعی طاقت	۷۰
۷	ہجرت و وطنیت	۷۴
	اخلاق	۷۹
۱	وقت کی قدر و قیمت	۸۱
۲	عزم و استقلال	۸۵
۳	خوش خلقی	۹۰
۴	برائی کا مقابلہ اچھائی سے	۹۴
۵	اخوّت	۹۸
۶	رائے کا اختلاف جو رحمت ہے	۱۰۲
۷	فقر کا قرآنی تصوّر	۱۰۷
۸	صبر و رضا	۱۱۱

(۹) مومن طمع سے مُبّرا ہوتا ہے ۱۱۶

(۱۰) امانت داری ۱۲۰

(۱۱) بد دیانتی ۱۲۴

(۱۲) سادگی ۱۲۸

(۱۳) بزرگوں کی تقلید اچھی باتوں میں ۱۳۴

رسوم ۱۳۹

(۱) اظہارِ مسرّت ۱۴۱

(۲) عید ۱۴۵

(۳) وداعِ رمضان ۱۴۹

علم و حکمت ۱۵۱

(۱) اقبالؔ ــــ علم ۱۵۳

(۲) طالبِ علم ۱۵۷

(۳) دعوتِ تبلیغ میں حکمت کا تصوّر ۱۶۱

(۴) بابِ علم ۱۶۵

عقیدت ۱۷۳

(۱) اسوۂ حسنہ ۱۷۵

(۲) رہبرِ اعظمؐ ۱۷۹

(۳) صاحبِ خلقِ عظیمؐ ۱۸۵

(۴) اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ ۱۸۹

(۵) فاتحِ خیبر ۱۹۳

(۶) جہادِ کربلا ۱۹۸

(۷) شبِ عاشور ۲۰۳

(۸) حضرت امام جعفرِ صادقؑ ۲۰۷

دین

توحید

ادیانِ عالم کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چاند سورج سے لگا کر شجر حجر اور حشرات الارض تک کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ مخلوق ایسی نہیں ہے جو کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی زمانہ میں انسان کی مسجود و معبود نہ رہ چکی ہو۔ پچھلی صدی میں جب ارتقاء (EVOLUTION.) کا عقیدہ لوگوں کے ذہن پر چھایا ہوا تھا تو عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسانی ذہن مظاہر و قوائے فطرت اور آباؤ ارواح کی پرستش سے بتدریج ترقی کر کے ایک اللہ کی پرستش کے عقیدہ تک پہنچا، لیکن توحید کا علم و یقین انسانی فکر کے تجربات عمل یا تدریجی ترقی سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ

"میری (محمدؐ رسول اللہ کی) طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ تمہارا خدا خدائے واحد ہے۔" (۲۱/۱۰۸ ، ۱۸/۱۱۰)

ایک اور جگہ پر ہے

"تجھ (محمدؐ رسول اللہ) سے پہلے ہم (خدا) نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس پر یہ وحی نہ کی ہو کہ سوائے میرے اور کوئی خدا نہیں ہے۔" (۲۱/۲۵)

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعہ توحید کے علم و یقین کو انسانوں تک پہنچاتا رہا اور انسان اپنی لغزش اور غفلت کی وجہ سے اس علم کے آنے کے بعد وادیٔ جہالت میں ان جھوٹے معبودوں کے پیچھے بھٹکتا پھرا۔ جو مردہ تھے زندہ نہیں تھے، جو اس کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے تھے نہ نقصان، جو اس کی ہدایت کرنا تو درکنار اس کی بات بھی نہیں سن سکتے تھے، جو کارِ تخلیق میں اللہ کے شریک نہیں تھے بلکہ خود مخلوق تھے یا ایک اسم تھے بے مسمیٰ لیکن اس کا یہ بھٹکنا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انسان کی جبلت میں خدا کے لیے ایک پیاس، ایک تلاش، ایک تڑپ موجود ہے۔ جب اس کے سامنے ایک خدا کا عقیدہ پیش کیا جاتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں، کوئی بیٹا نہیں، کوئی اُس جیسا نہیں تو اسے بڑی حیرت ہوتی ہے لشئ عجاب لیکن اسی علم و یقین کو جب

وہ اپنا سینہ کھول کر قبول کرتا ہے تو اس کے قلب کو اطمینان میسر ہوتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عہد جو کبھی اس کی فطرت نے کیا تھا پورا ہو رہا ہے۔ یہ ایک نئی زندگی ہے۔ اس کی پہلی حالت میں اور اس نئی حالت میں ایسا فرق ہوتا ہے جیسا اندھے اور بینا میں، یا ظلمت اور نور میں۔ اسی ایمان بالغیب سے عالمِ شہود کا مطلب اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور اپنے راستہ اور منزل کی طرف اس کی ہدایت ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے غلط استدلال اور تمرد سے اس علم و یقین اور اس نورِ معرفت کو اپنے سینہ سے زائل کر دیتا ہے جس طرح مادی دور کا انسان اس کو زائل کرنے کے درپے ہے تو پھر بر و بحر کی ظلمات سے اس کو نجات دینے والا کوئی نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک بڑا گہرا تاریک دریا ہو، لہریں ایک دوسرے کے اوپر، ابر تہ بہ تہ ڈھانکے ہوئے، تاریکیاں ہیں کہ ایک کے اوپر ایک اُمنڈی چلی آتی ہیں۔ اس تاریک بھنور میں گھرا ہوا انسان اپنا ہاتھ نکالنا چاہے تو خود اپنے ہاتھ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ کو کھو دینے کے بعد انسان کی نفسیاتی اور آفاقی الجھنوں کی اور جتنا وہ ان الجھنوں سے نکلنے کی کوشش کرے تو اور زیادہ ان میں پھنسنے کی کتنی سچی تمثیل ہے۔

ہمارے عقیدہ کے مطابق تمام رسل اور انبیاء کی تعلیم ایک ہی تھی۔ ایک خدا پر عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے جتنے رسول ہوں ان سب کی تعلیم ایک ہو۔ ان سب پر بھی وحی کی گئی تھی کہ سوائے اللہ کے کوئی الٰہ نہیں۔ محمدؐ رسول اللہ کا لایا ہوا پیغام چونکہ آخری اور مکمل پیغام ہے اس لیے اس میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیا گیا ہے۔ دینِ اسلام کی یہی سب سے اہم اور بنیادی خصوصیت ہے۔

"اے اہلِ کتاب کیا تم اللہ کے معاملہ میں ہم سے حجت کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور وہی تمھارا رب ہے۔ ہاں ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے ہیں۔" (۲/۱۳۲)

"اللہ کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے۔ حیّ اور قیّوم۔ اسی نے تیرے اوپر برحق کتاب نازل کی جو اپنے سامنے کی چیزوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اسی نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل کو نازل کیا۔" (۳/۱)

"اور تم کہہ دو کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا اور جو تم پر نازل ہوا۔ ہمارا اللہ اور تمھارا اللہ ایک ہی ہے۔ ہم اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔" (۲۹/۴۶)

اسی کلمۂ توحید سے حضورؐ نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی۔ کسی پروگرام کا بلوپرنٹ (BLUEPRINT) دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا "کہ اے لوگو کہو کہ سوائے اللہ کے کوئی الٰہ نہیں، کہو اور فلاح پاؤ گے۔" گویا کلمۂ توحید ایک بیج ہے جس کو اپنے قلب میں بونے سے نئی زندگی کا درخت پیدا ہوتا ہے۔

اپنے گرد و پیش کائنات پر غور کرو۔ زمین و آسمان کی خلقت میں، لیل و نہار کے اختلاف میں، کشتیوں میں جو انسان کے فائدہ کے لیے سمندر پر چلتی ہیں۔ اور اسی کے مثل فضا میں چلنے والی سواریوں میں، آسمان سے بارش کے نازل ہونے میں جس سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، اور ہر قسم کے جانور زمین پر پھیل جاتے ہیں، ہواؤں کے چلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ تمھیں بڑی بڑی نشانیاں ملیں گی۔ سورج اور چاند کو دیکھو کہ بغیر کسی تصادم کے اپنے اپنے مقررہ راستہ اور قانون پر سجدہ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز کل کائنات میں اپنا مخصوص مقام رکھتی ہے۔ ہر شئے دوسری شئے سے مربوط ہے، کہیں سرمو تفاوت نہیں ہے۔ حیرت انگیز تنوع اور کثرت میں تم ایک وحدت پاؤ گے۔ اس پُر اسرار کائنات میں جہاں ہر معلوم شئے ایک عالمِ اسرار ہے تم سب سے بڑا راز یہ دیکھو گے کہ یہ کارخانہ کس شان و ابہت کے ساتھ، کس جلال و جمال کے ساتھ، کس وقار و استقلال کے ساتھ چل رہا ہے۔ تمھارا قلبِ سلیم اس حقیقت پر گواہی دے گا کہ اس کا خالق ایک ہے، وہی زمین پر خدا ہے وہی آسمان میں خدا ہے۔ وہی جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے، مارنے والا اور جلانے والا بھی ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے، حی و قیوم ہے، عزیز و حکیم ہے۔ اگر ایک خدا کے علاوہ اور خدا ہوتے تو سب اپنی اپنی مخلوق کو لیے پھرتے، ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے، ہر معبود مالکِ عرش تک پہنچنے کی سبیل ڈھونڈتا اور تمام کائنات میں فساد ہو جاتا۔

اپنے چاروں طرف (آفاق) دیکھنے کے بعد اپنے اندر (انفس) دیکھو۔ اگر تم متفرق خداؤں کی عبادت کروگے، خواہ وہ شجر و حجر کے خدا ہوں یا وہم و وسواس کے خدا ہوں یا ہوا و ہوس کے خدا ہوں، یا دولت و طاقت کے فرعون و طاغوت ہوں، اور ان سے بیم و رجا کو وابستہ کروگے تو تمھاری جو ایک وحدت ہے پاش پاش ہو کر منتشر ہو جائے گی، اور تمھاری فنا فنائے کلّی ہوگی۔ اگر تم ایک خدائے قہّار کی عبادت کروگے اسی سے اپنی بیم و رجا کو وابستہ کروگے۔ اسی کے لئے اپنی عبادتوں کو اور اپنے مرنے اور جینے کو وقف کروگے تو تمھاری خودی خدا کے رنگ میں رنگ جائے گی اور تم کو بقائے دوام حاصل ہوگی۔

اس اللہ کا کوئی ہمسر و ثانی نہیں۔ نہ وہ تین میں سے ایک ہے۔ نہ ملائکہ اس کی بیٹیاں ہیں نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ نہ اس کو ان باتوں کی احتیاج۔ جب وہ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے وہ ہو جاتی ہے۔ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہے مصطفےٰ کر سکتا ہے۔ وہ اللہ ہے سوائے اس کے کوئی الٰہ نہیں۔ اور وہ پاک ہے ان تمام باتوں سے جو لوگ اس پر افترا کرتے ہیں۔

قل ھو اللہ احد۔ اللہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔

ولم یکن لہٗ کفوًا احد ہ

دین کی جامعیت

دین کی تمثیل ایک درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط ہیں، جو آسمان تک بلند ہے، شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، ہر موسم میں اس میں پھل آتے ہیں۔ جاندار اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ افقی جہت میں جس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ اس کی زمین ہے جس میں یہ مستحکم اور قائم ہے۔ عمودی جہت میں اس کے عروج اور رفعت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثر اور کارفرمائی سے باہر نہیں ہے اور زمانے کا کوئی دور ایسا نہیں ہے جس میں اس کی ضرورت اور منفعت ختم ہو جائے، اس شجرۂ طیبہ کا بیج کلمۂ طیبہ توحید ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہو اور فلاح پاؤ۔ اسلام کی تمام تعلیم اسی کلمہ کے آداب و شرائط ہیں۔ یہی عقیدہ ہے جس کی انسان کے خیال اور ارادے، قول اور فعل میں کارفرمائی دین ہے، یہی ایمان ہے جس سے عملِ صالح پیدا ہوتا ہے، ایک ہستی سے تعلق پیدا کرنا۔ جو پیدا کرنے والا اور پالن ہار ہے، جو باپ سے زیادہ شفقت کرنے والا رؤف ہے، ماں سے زیادہ محبت کرنے والا حنّان ہے، اولاد سے زیادہ ولی و وارث ہے، دوست سے زیادہ وُدود اور رفیقِ تنہائی ہے، حالتِ اضطرار میں پکارو تو جواب دینے والا اور بُری حالتوں کو دُور کرنے والا، جو تمام باتوں کو دیکھنے والا اور سننے والا ہے اور ستّار ہے جو قادر ہے مگر ظالم نہیں عادل ہے۔ جو منتقم بھی ہے، حساب لینے والا ہے، جزا اور سزا دینے والا ہے، جو اوّل ہے آخر ہے، ظاہر ہے باطن ہے اور جس کے سوا کچھ نہیں ہے مگر اس تعلق کی وجہ سے جو اس سے ہے، ایسی ہستی سے رشتہ استوار کرنا انسانی شعور کی تطہیر اور نفس کا تزکیہ ہے اور پھر یہ شعور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، اس کے تمام معاملات میں اور اخلاق میں ایک روح اور روشنی کی طرح پھیل جاتا ہے، یہی عقیدہ سیاسی اور سماجی زندگی میں آزادی اور مساوات کی بنیاد ہے۔ اس لیے کہ خدا کا بندہ کسی اور انسان کا یا واہمہ کا یا راز کا یا طاقت کا بندہ نہیں ہو سکتا، اور خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اللہ تمام عالموں کا رب ہے۔ اس کا

رسولؐ تمام عالموں کے لیے رحمت ہے اور اُس کی کتاب تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔

خدا کی نسبت سے انسان کا کائنات میں مقام متعین ہوتا ہے۔ اسی آئینہ میں وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے، انسان کو بہترین تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔ بدی اور نیکی کی راہ اس کو دکھائی گئی ہے، اپنی راہ متعین کرنے کا اختیار اس کی آزادی بھی ہے اور ذمہ داری بھی ہے۔ یہ امانت کا بوجھ اس کے اوپر ہے جس کو پورا کرنے میں جہل اور ظلم رکاوٹیں ہیں، وہ چاہے تو اثبات کا راستہ اختیار کرلے یا انکار کا راستہ اختیار کرے، شاکر بندہ بنے یا کافر بندہ بنے، مگر یہ تمام ذمہ داری اس کی اور محض اس کی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی کرامت سے نوازا ہے۔ اس کا منصب اعلیٰ خلافتِ الٰہی ہے۔ اس کا شرف یہ ہے کہ وہ براہِ راست اللہ سے اپنا رشتہ قائم کرسکتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور نبیؐ بھی جامۂ بشریت زیبِ تن کیے ہوئے ہیں۔ دن اور رات کو، چاند سورج، ستاروں کو، دریاؤں اور سمندروں کو، اور زمین میں جو کچھ ہے اس کو خلق کیا گیا ہے، اسی کے لیے پانی جو ہر قسم کی زندگی کا سرمایہ ہے آسمان سے نازل کیا گیا ہے لیکن خود اس کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے، فطرت کے جتنے مظاہر ہیں وہ آیاتِ الٰہی ہیں، ان میں سے اکثر نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی ہے، کائنات کی کوئی شئے حقیر نہیں ہے، اس لیے کہ اس کو حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہم زمین و آسمان اور ہواؤں اور سمندروں کے خزانوں کو، اللہ کے بندوں کو غلام اور ان کا استحصال کرنے کے لیے استعمال کریں گے تو اللہ کی دنیا ظلم و فساد سے بھر جائے گی۔ اگر ان خزانوں کو اللہ کے نافرمان بندوں کی طرح اپنی نفس پروری کے لیے بے دریغ اور بے تحاشا لوٹنے کھسوٹنے میں لگ جائیں گے تو یہی زمین اور ہوا اور پانی جن کو ہمارے لیے مسخر کیا گیا ہے ہمارے حلقۂ اطاعت سے نکل کر ہمارے خلاف بغاوت کریں گے کیونکہ یہ سب اللہ ہی کے ہیں۔ خلق اور امر اور حکم سب اسی کا ہے۔ یہ قدرت کے خزانے اس لیے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان سے اپنی متاعِ حیات حاصل کریں، اللہ کا شکر کریں، علم میں ترقی کریں، عدل قائم کریں، آگہی اور معرفت میں آگے بڑھیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک ناتوانی بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسان کے خدا سے تعلق اور انسان کے کائنات میں مقام کے بعد انسان کا انسان سے تعلق زندگی کا اہم شعبہ ہے۔ انسانوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ قبیلے اور خاندان محض اس لیے ہیں کہ تم پہچانے جا سکو۔ انسانی جان کا احترام انسان کا اوّلین فرض ہے۔ اگر کسی نے بغیر حق کے انسانی جان کو تلف کیا تو یہ ظلم اور بغاوت ہے۔ اس نے گویا تمام انسانیت کو قتل کر دیا اور اس کی سزا جہنم کی آگ ہے۔ انسان کی کرامت اور بزرگی نہ نسل میں ہے، نہ رنگ میں، نہ زر میں نہ زور میں بلکہ تقویٰ میں ہے۔ تمام انسانی تعلقات کے حقوق و فرائض متعین اور معلوم کر دیئے گئے ہیں۔ ہم پر جس کا جو حق ہے اس کو پورا کرنا فرض کی ادائیگی ہے۔ یہی حق ہے، یہی عدل ہے اور یہی دین ہے۔ دوسروں کا نقصان کر کے اپنا فائدہ کرنا ظلم ہے۔ ناپ تول میں توازن ٹھیک رکھنے کے یہی معنی ہیں۔ زندگی کے تمام لین دین ایک میزان ہیں جس میں کمی کرنا ظلم ہے۔ اپنے وعدے پورا کرنے کا حکم ہے۔ اسی پر معاشرے کی اساس ہے۔ اسی سے معاشرے میں اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے۔ اعتماد ہی سے معاشرے کی شیرازہ بندی ہے، دھوکہ دہی، مکاری اور وعدہ خلافی سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ حلال طریقے سے روزی کمانا خدا کے فضل کی تلاش ہے۔ حرام کمائی اپنے پیٹ کو انگاروں سے بھرنا ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں فضول خرچی بھی غلط ہے، بخل بھی مذموم ہے، مال و دولت کو جمع کر کے رکھنا جہنم کی آگ کی طرف جانا ہے۔ مال و دولت مقصدِ حیات نہیں ہے متاعِ حیات ہے۔ یہ جمع کرنے کے لیے نہیں ہے خرچ کرنے کے لیے ہے۔ اپنی ضروریات پوری کر کے، اور حقداروں کا حق نکال کر اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ سے سودا ہے، اللہ کو قرض دینا ہے۔

تمام معاشرے کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت یعنی سماجی اصطلاح میں آزادی اور مساوات پر اور آپس کے تعلقات میں، احسان پر ہے، انسانی اخلاق کی تکمیل میں انسان کی کسی فطری خواہش کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ عدل کے معنی فطری ضرورتوں اور تقاضوں کو کچلنا نہیں بلکہ ان کو صحیح مقام پر رکھنے کے ہیں، انسان کی خواہشوں کا تزکیہ کیا گیا ہے اور ان کو پورا کرنے کا صحیح مصرف اور صحیح طریقہ بتایا گیا ہے۔ طاقت وہی مستحسن ہے جو نیک ذرائع سے پیدا ہو۔

اور طاقت کا جواز محض نیکی پھیلانا ہے۔ دنیاداری کو مناسب شرائط اور حدود کے اندر برتنا دیانتداری ہے۔ موسوی شریعت میں قانون پر زور دیا گیا ہے جو ایک خارجی دباؤ ہے۔ عیسوی تعلیم میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے جو ایک داخلی اپج ہے، قانون اور اخلاق کی اہمیت کو ذرّہ برابر کم نہ کر کے ان میں اعتدال پیدا کرنا اسلامی عدل ہے۔ عدل کی ضد ظلم ہے اور اسلام کی تمام تعلیم زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، ظلم کی بیخ کنی اور عدل کو قائم کرنا ہے۔ اس کے لیے بیدار شعور اور مسلسل جہد کی ضرورت ہے، اس لیے ہمیں مل کر حق کے راستے پر صبر و استقلال کے ساتھ جمے رہنے کا حکم دیا گیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا ہر مومن پر حق ہے۔ جب اس فریضہ سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں تو معاشرے پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی جاتی ہے۔ یہی عدل اپنے اخلاق میں، اپنے معاشرے میں، ساری دنیا میں قائم کرنے کے لیے اپنی جان و مال کے ساتھ اپنی تمام توانائیوں، اور صلاحیتوں کے ذریعے مسلسل جدوجہد کرنا جہاد ہے اور جہاد ہی دین کا جامع فلسفۂ حیات ہے۔

مومن کی زندگی

قرآنِ حکیم میں ذکر و تمثیل کے طور پر زندگی کے مختلف نمونوں کی توضیح کی گئی ہے۔ دنیوی زندگی۔ کافر کی زندگی، مشرک کی زندگی، فرعون کی زندگی، مومن کی زندگی، منافق کی زندگی، جنت کی زندگی، جہنم کی زندگی وغیرہ وغیرہ۔ یہ زندگی کے مختلف شئون و کیفیات و درجات ہیں۔ دنیوی زندگی جس کو قرآنی اصطلاح میں الحیاۃ الدنیا کہا گیا ہے۔ دنیا میں زندگی گذارنے کو نہیں کہتے۔ دنیا میں تو سب ہی زندگی گذارتے ہیں۔ کاروانِ حیات کا اس وادی میں سفر تو ناگزیر ہے۔ الحیاۃ الدنیا کی ضد ترکِ دنیا نہیں ہے۔ نہ مرنے کے بعد کی زندگی ہے بلکہ یہ دنیا ہی میں زندگی گذارنے کا ایک طریقہ یا جیسا کہ اس ترکیب سے ظاہر ہے کہ یہ زندگی ہی کی ایک قسم یا صفت یا حالت ہے۔ دنیوی زندگی یا الحیات الدنیا اپنی زندگی کے مقصد سے غافل ہو کر اس دنیا کی حقیقت کو غلط سمجھ کر اس کی زینتوں میں اپنے آپ کو کھو دینے کو کہتے ہیں ؎

چیست دنیا؟ از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ دنیوی زندگی لہو و لعب ہے، مال و اولاد میں اس کی زینت ہے، آسائش و آرائش کی چیزوں کی کثرت اس کا سرمایہ ہے، ایک دوسرے کے مقابلہ میں مفاخرت اس کا حاصل ہے۔ یہ متاعِ غرور ہے اس لیے کہ اپنی عاجلہ لذتوں سے اور طاقت اور عزت کی زینتوں سے، اور دوام و ثبات کے جھوٹے وعدوں سے اپنے اوپر فریفتہ کرتی ہے اور اپنے اندر انہماک پیدا کر کے اپنے طالبوں کو طرح طرح کے انتشار اور الجھنوں اور تضادات اور محرومیوں میں مبتلا کرتی ہے، اور ان کو کشاں کشاں زوال و ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ متاعِ قلیل ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے

بارش ہوئی، سبزہ اُگا، زمین اپنے سنگھار پر آگئی، جاہل وظالم انسان یہ سمجھا کہ اس تمام رونق وسنگھار پر اس کو قدرت حاصل ہوگئی، پھر اللہ کے حکم سے وہ سارا سبزہ جیسے کٹ کر ڈھیر ہوگیا گویا کہ کل یہاں کچھ بھی نہ تھا، جو شخص دنیوی حیات پر راضی ہوگیا اور اسی کو اس نے اپنا مطمعِ نظر بنا لیا، اس کو اگر دنیا سے کوئی حصّہ نہ ملا تو حسرت و حرماں اس کا نصیب ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں سے وافر حصّہ مل گیا تو وہ جتنا سمجھتا ہے کہ دنیا کو اس نے تسخیر کیا اتنا ہی اسی سے مسخر ہوتا ہے، بھوک کو دور کرنے کے جتنے سامان مہیا ہوتے ہیں اتنی ہی سیری کی بجائے بھوک اور بڑھتی ہے۔ خوف پر غالب آنے کی جتنی تدبیر کرتا ہے اتنا ہی مقام امن سے دور ہوتا ہے۔ ہوس کے سراب سے نہ قلب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے نہ روح کو بالیدگی اور وہ کتنا ہی اس تلخ حقیقت کو بھلانے کی کوشش کرے ایک وقت ضرور آتا ہے جب اس کو اس طریقِ زندگی کے لاحاصل اور فضول اور بے معنی ہونے کا احساس شدید ہوجاتا ہے۔ یہ جہل وظلم کا طریق ہے۔ جہل کا اس لیے کہ اس جہل کی وجہ سے وہ اپنی منزل ومقصد سے غافل ہوگیا اور اس نے اپنی اور اپنے خدا دونوں کی ناقدری کی۔

قرآنِ حکیم ہمیں بشارت دیتا ہے کہ اسی گھاٹے اور زوال اور ہلاکت کی وادی میں ایک ایسی زندگی کا راستہ بھی ہے جس میں نہ گھاٹا ہے نہ زوال نہ ہلاکت ہے۔ جس میں زندگی ہی زندگی ہے۔ ایسی زندگی جس کی نعمتوں اور بلندیوں کی نہ کوئی حد ہے نہ مدت ہے۔ جس میں باقیات الصالحات ہیں، جس میں اجرِ غیر ممنون ہے اور وہ ایمان اور عملِ صالح اور حق کے ساتھ صبر واستقلال سے تمسک کی زندگی ہے۔ ہم دینِ اسلام کا تعارف اس طرح بھی کرسکتے ہیں کہ دینِ اسلام دنیوی زندگی میں ایمانی زندگی کی بشارت اور اس کی طرف ہدایت ہے۔ ایمان اللہ کی ہستی کا اعتراف اور تصدیق ہے کہ اسی ایک اور یکتا وجودِ حقیقی سے تمام اشیاء موجود ہوئے۔ وہی ان کا مالک ہے، وہی ان کا رب ہے اور تمام حمد اور عبادت اس کے لیے ہے۔ اس نے اس کائنات کو باطل نہیں پیدا کیا بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور اس میں اس کا قانونِ عدل جاری وساری ہے جس میں اس کی غفاریت

اور رحمانیت کی شان بھی شامل ہے اور قہاریت و جباریت کی شان بھی۔ فرشتے اس کی فرمانبردار مخلوق ہیں جو عالمین میں اس کے امر کو پہنچاتے ہیں۔ اُس نے بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے مصطفیٰ بندوں کو بھیجا اور فرشتوں کے ذریعہ ان پر اپنی کتابیں نازل کیں۔ اور اس ہدایت کے سلسلہ کو قیامت تک قائم رکھنے کا انتظام کیا یہی فرقان ہے، یہی میزان ہے جس کے مطابق ہم اپنے مالک کے سامنے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں سب کے لیے جوابدہ ہیں، اور وہی ہمیں سزا و جزا دینے والا ہے ــــ مختصراً اس بنیادی اور کُلّی اور انتہائی حقیقت کی مکمل تصدیق ایمان ہے۔

قرآنِ حکیم میں دنیوی زندگی سے ایمانی زندگی کی طرف رجوع کو ظلمت سے نور کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب دیکھنے والی آنکھ، سننے والا کان اور سمجھنے والا قلب مل گیا۔ یہ ایک نئے شعور کی بیداری ہے، ایک نئی زندگی ہے، جس کو حیاتِ طیبہ بھی کہا گیا ہے۔ جس زندگی میں انسان اپنے ایمان کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، اب جب نظر اور شعور پیدا ہو گیا تو دنیا بے معنی اور زندگی بے مقصد نہیں رہی، اب اپنا مقام بھی سمجھ میں آگیا کہ ہم دنیا کے لیے نہیں ہیں اور ہم اللہ کے لیے ہیں، اور دنیا کے معنی اور مصرف بھی سمجھ میں آگئے کہ دنیا باطل نہیں ہے کہ اس کو ترک کیا جائے۔ اس دنیا میں سچائی اور حکمت ہے اس لیے کہ دنیا میں رہ کر ہی اپنا جوہر آشکار ہوتا ہے اور ایک فرد کی بشریت عبدیت کی لامتناہی منازل میں ترقی اور تربیت پا سکتی ہے، اس دنیا میں اپنے حصّے کو بھولنا نہیں ہے بلکہ اسی سے دارِ آخرت کو کمایا جاتا ہے۔ دنیا ہی تو آخرت کی کھیتی ہے، یہی اللہ کا انعام ہے اور ہمارا امتحان ہے۔ جناب امیرؑ نے ارشاد فرمایا:

"بلاشک جو اس دنیا کی سچائی کی تصدیق کرے اس کے لیے یہ دنیا دارِ صدق ہے، جو اس کے مکر کو سمجھ گیا اس کے لیے دارِ عافیت ہے، جو اس سے زادِ راہ حاصل کرے اس کو غنی کر دیتی ہے، جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لیے وعظ و نصیحت کا محل ہے، یہ اللہ

کہ دوستوں کی مسجد ہے، اللہ کے فرشتوں کا مُصلّیٰ ہے، اللہ کی وحی کا مہبط ہے، اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے، جس میں وہ اللہ کی رحمت اور فضل کا سودا کرتے ہیں اور منافع میں جنّت کماتے ہیں۔"

مومن کے لیے آفاق و انفس میں اللہ کی آیات ہیں، وہ اس میں تفکّر و تعقل کرتا ہے، نوامیسِ قدرت کا علم حاصل کرتا ہے، قوائے فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ وہ دنیا سے رزق حاصل کرتا ہے اور حکمت حاصل کرتا ہے، ــ اور اس کے لیے تسخیرِ فطرت فساد فی الارض کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ رضائے الٰہی اور خلافتِ ارضی کی نوید ہے۔ وہ جو کچھ علم، رزق یا حکمت حاصل کرتا ہے اس سے بندگانِ خدا پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی بجائے ان کو دل کھول کر، توکل بخدا، اللہ کی راہ میں صَرف کرتا ہے، تاکہ داخلی اور خارجی بتوں کی خدائی ختم ہو، اور اوّل و آخر، ظاہر و باطن ایک خدا کی عبادت قائم ہو، عدل کا رواج ہو، افلاس اور احتیاج اور ہر طرح کے خوف سے آزادی حاصل ہو، ارتقائے بشریت کی راہیں کھلیں اور اس راستہ کی تمام رکاوٹیں اور پسماندگیاں اور ناہمواریاں دور ہوں اور اللہ کی رحمت کے لیے اپنی نجات کا بہانہ مہیا کرے۔

مقامِ شہادت

(۱)

لفظِ شہادت کے معنی کے دو پہلو ہیں، دیکھنا اور گواہی دینا، دیکھنے کا مطلب ہے بصارت سے دیکھنا یا علیٰ وجہ بصیرت دیکھنا، اور امکان کی حدود میں اس طرح دیکھنا جیسے کوئی شئے حقیقت میں ہے، اور گواہی کا مطلب کسی حقیقت کا بیان یا اعلان کرنا تاکہ عمل صحیح بنیادوں پر قائم ہو سکے یا ایسا عمل کرنا جس سے از خود اس حقیقت کا اعلان ہو اور اس حقیقت کا نگراں ہونا ہے۔

قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہید ہے، وہ اپنے اوپر گواہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے، یہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی اپنی وحدانیت اور علم و قدرت اور حکمت پر گواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ پر شہید ہے، اور رسولؐ پر اس کی شہادت کلامِ پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر اور کائنات کی ہر شئے پر شہید ہے وہ سمیع و بصیر ہے، اور اس کا علم ہر شئے پر محیط ہے اور ہر شئے کتابِ مبین میں ہے، جو اس کا علم بھی ہے اور حساب بھی اور اس کا جزا اور سزا کا قانون اس دنیا اور عاقبت میں جاری اور قائم ہے، وہ رسولؐ کی رسالت اور صداقت پر، اور ہماری تصدیق و اطاعت پر ہمارے اور رسولؐ کے مابین گواہ ہے اور وہ گواہ کافی ہے۔

اس کا رسولؐ شہید ہے، وہ اللہ پر شہید ہے، اس معنیٰ میں کہ جو پیغام وہ ہم تک لایا ہے اللہ ہی کا پیغام ہے اور ہمارے لیے اللہ کی معرفت اسی کے ذریعہ ممکن ہے۔ مختصراً اس شہادت کی شان یہ ہے کہ اگر اللہ کا رسولؐ اپنے قول و عمل سے یہ گواہی نہ دیتا تو ہم اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ پہچان سکتے، اور اللہ کا رسولؐ ہمارے اوپر گواہ ہے کہ ہم نے اس پیغام کو کس حد تک ایمان اور عمل سے قبول کیا ہے۔ شاہد ہی شفیع ہو سکتا ہے، اور چونکہ وہ تمام انبیاء کا وارث اور خاتم ہے اس لیے تمام گواہوں پر گواہ ہے۔

اور امتِ محمدیؐ کا مقام یہ ہے کہ وہ اجتماعی اور انفرادی طور پر اعلائے کلمۃ الحق اور اطاعتِ رسولؐ سے اپنے اللہ اور رسولؐ کی گواہی دے اور اس کا منصب یہ ہے کہ وہ تمام عالمِ انسانیت پر شہید بنے اور دنیا میں اللہ کی حاکمیت قائم کرے اور مسکنت اور ذلت کی لعنتوں کو دور کرے اور نیکیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو نیست و نابود کرے۔

مومن کا ایمان تین شہادتوں کے بغیر معتبر نہیں ہے، پہلی شہادت اس کے شعور اور ضمیر کی ہے کہ اس کا ایمان علیٰ وجہ بصیرت یقین کے کس درجہ پر ہے اور وہ اپنے عمل میں کس حد تک حق اور باطل کی کسوٹی بن سکا۔ دوسری شہادت اس کی رسولؐ پر ہے جو رسولؐ کی اطاعت اور اس کی عقیدت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور تیسری شہادت اس کی اللہ پر ہے جو اللہ کی عبادت اور اس پر توکل و تفویض سے نصیب ہوتی ہے۔ ان تین شہادتوں کے بعد مومن کا ایمان معتبر ہوتا ہے، اس طرح قرآنی اصطلاح میں شہادت خدا اور کائنات کے متعلق شعور کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے، اور ہر ذی شعور ہستی، اللہ تعالیٰ کی ہستیِ مطلق سے لگا کر بندوں تک شہید ہے، اس طرح کہ شاہد بھی ہے اور مشہود بھی، شعور کی کائنات میں ربطِ باہمی کا نام شہادت ہے۔

(۲)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی معرفت کروائی ہے جن پر اس کی نعمتیں نازل ہوئی ہیں۔ وہ انبیاء ہیں اور وہ صدیقین ہیں اور وہ شہداء ہیں، اور وہ صالحین ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بہترین صحبت اور رفاقت بتایا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ ان چار لفظوں میں، نبی اور صدیق اور شہید و صالح میں وہ تمام صفات و خصوصیات آگئیں جو کسی ملت کی بقاء اور فلاح کے لیے ضروری ہیں۔

ہر ملت کی تاسیس کسی نبی کے ہاتھ سے ہوتی ہے، وہی خیر اور نظر سے، جدل اور پیکار میں تباہ ہوتے ہوئے انسانوں میں محبت اور اخوت کی روح پھونکتا ہے اور ایک بکھیڑے سے ملت کو تراشتا ہے، ملت کے مزاج اور اخلاق کا قوام وہی تیار کرتا ہے، وہی اس کی اپنی مخصوص سمت میں ہدایت کرتا ہے اور اس کی تقدیر کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ مقامِ نبوت ہے، ناموسِ نبوت ملت کی سب سے گرانبہا امانت ہے۔ اگر یہ امانت ختم ہو گئی تو ملت ختم ہو جاتی

ہے، پھر یہ بھی نہ ہو کہ وہ امانت تبرکات کی صورت میں کسی تابوت یا صندوق میں رکھی رہیں، اور لوگ اس تابوت یا صندوق یا طاق یا جزدان کی پرستش کرتے رہیں بلکہ ملت میں وہ لوگ ہوں جو قلب اور قول اور فعل سے اس سچائی کی تصدیق کرتے رہیں، سچائی کو پجاریوں کی ضرورت نہیں ہے، سچائی بت نہیں ہے، سچائی کو زندگی کی تصدیق چاہیئے۔ سچائی کی شاہد زندگی ہے، اور ملت کے اندر شہادت کی صفت پائی جانی چاہیئے۔ بحیثیت مجموعی وہ ملت اپنے اللہ اور رسولؐ کی گواہی دے، اور اس قوم میں وہ لوگ ہوں جن کی زندگی اور موت میں لوگ یہ دیکھ سکتے ہوں کہ یہ کیسے اللہ کے بندے اور کس رسولؐ کے امتی ہیں، اور جن کی زندگی اور اس ملت میں صالحیت ہو یعنی وہ اللہ اور رسولؐ کے قانون اور ہدایت کی روشنی میں اپنے ماحول اور زمانے کے تقاضے پورا کرنے کی اور اپنے زمانے اور ماحول کو منشائے الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی مکمل صلاحیت، جس ملت میں یہ صفات موجود ہوں گی اس کی بقاء اور خوب سے خوب تر زندگی کی طرف ارتقاء لازمی ہے۔ نہ وہ ملت کبھی اپنے راستہ سے ہٹ کر گمراہ ہوگی، نہ وہ ملت کبھی عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوگی بلکہ اس پر پیہم اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کی بارش ہوگی جن کو وہی جانتا ہے۔

(۳)

اس پس منظر میں عام اصطلاح میں جسے شہادت کہا جاتا ہے اس کے معنی اور مقام سمجھ میں آجاتے ہیں۔ شہادت کسی ہنگامی موت کو نہیں کہتے، شہادت مجبوری کی موت کو نہیں کہتے، شہادت علیٰ وجہ بصیرت زندگی اور موت کے متعلق ایک واضح رویہ اختیار کرتا ہے اور وہ رویہ یہ ہے کہ دنیا میں ایک فرد کے لیے عزیز ترین چیز، اس کے عزیز و اقرباء، اس کی مال و دولت، اور زندگی کی تمام گوناگوں زینتوں اور رعنائیوں سے زیادہ عزیز، حق اور انصاف کے راستہ میں اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں جدوجہد کرنا ہو اور زندگی کا بہترین حاصل اور بلند ترین مصرف یہ ہو کہ اسی جدوجہد میں اس کی جان چلی جائے۔

اس جدوجہد یا جہاد کا میدان صرف کافر اور مسلم کی جنگ نہیں ہے، بلکہ اپنی ملت کا کردار

اخلاق اور اپنے نفس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں جو طرح طرح کے ظلم کے داخلی اور خارجی بُت پوجے جاتے ہیں ان کی حکومت ختم ہو، اور حق اور انصاف کا دَور دورہ ہو۔ شرک کی تاریکیوں میں توحید و عدل کا نور پھیلے، اگر اس کی ملّت پر جس کا واحد جواز یہ ہے کہ وہ کلمۃ الحق کی حامل ہے کفر کی یلغار ہو تو وہ اپنی ملّت کا آخری قربانی تک دفاع و تحفظ کرے، اور اگر خود اس کی ملّت، دولت اور حکومت کے فریب میں آکر اپنے راستہ سے ہٹ جائے تو وہ خواہ تن تنہا ہی سہی اپنے راستے سے، صراطِ مستقیم سے ایک سرِ مو نہ ہٹے اور اپنی ملّت کو بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی اور چھوڑے ہوئے راستے پر لانے کی انتہائی کوشش کرے، اگر خود اس کی ملت میں ظلم حکومت اور طاقت کے زور، اپنے استقلال اور استحکام کی سعی کرے تو وہ ذرا اور تلخی اور تیزی کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کرے، اور اپنے نفس کا جائزہ لے کہ اس راستے میں جو سختی اور تنگی آئے وہ اس کے ایمان اور عمل کو اور زیادہ پختہ کرنے والی ہو، اور اس جادۂ تسلیم و رضا کے مسافر کا مقصد سوائے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ سب جہاد کے میدان ہیں، اور ان میدانوں میں مردانہ وار جان دینا شہادت ہے، کیونکہ حقیقت کی خاطر جان دینے سے زیادہ حقیقت کی کیا روشن گواہی ہو سکتی ہے۔

(۴)

محض اپنی جماعت کی خاطر جان دینا شہادت نہیں ہے۔ ہر جاندار جو جبلّی طور پر ایک گروہ کا فرد بن کر رہتا ہے۔ اپنے گروہ کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، یہ جہد للبقا میں ایک فطری تقاضہ ہے۔ ایک ڈاکو بھی اپنی جماعت کے تحفظ اور بقا کے لیے حیرت انگیز شجاعت دکھا کر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ بھی اس معاشرہ کی خاطر لڑ کر جان دے رہے تھے۔ جس کے لیے ظہورِ اسلام موت کا پیغام تھا۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں جہاد اور شہادت کے لیے "فی سبیل اللہ" کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ "جو لوگ سچے ایماندار ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔"

گویا شہادت کسی دنیوی حکمرانی سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ایک سودا اور معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں سے ان کے نفوس اور ان کے مال خرید لیتا ہے۔ اس کے عوض ان کو جنت دیتا ہے۔ پس یہ لوگ اللہ کے راستے میں قتال کرتے ہیں، دشمنوں کو دفع کر کے شجاعت کی سعادت حاصل کرتے ہیں، خود مر کر شہادت کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ یہ سودا بڑی کامیابی کا سودا ہے۔ ان لوگوں کی جو یہ سودا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ یہ خصوصیات بتاتا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے، اللہ کی عبادت کرنے والے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے، اس کی خاطر اپنے گھر کو چھوڑنے والے، نیک باتوں کا لوگوں کو حکم دینے والے، بری باتوں سے منع کرنے والے، اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔

خدا اور شیطان دونوں ہی انسان کی روح کا سودا کرتے ہیں۔ خدا کا سودا تم نے دیکھ لیا، جب انسان زندگی کی اعلیٰ قدروں کو قربان کر کے دولت یا طاقت یا اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے یا اپنی کسی اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتا ہے تو یہ اس کا شیطان سے سودا ہوتا ہے۔ شہادت کے مقابلے میں یہ راستہ ہلاکت کا ہے۔ اس راستہ پر جینا بھی ہلاکت ہے اور مرنا تو ہلاکتِ ابدی ہے۔ اگر انسان اپنے سے پست مقصد کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرتا ہے اور اپنے آپ کو ضائع کرتا ہے تو یہ ہلاکت ہے۔ شہادت زندگی کی صحیح قدر کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا صحیح مصرف معلوم کرنا اور اس کو صحیح مصرف میں استعمال کرنا اس چیز کی صحیح قدر ہے۔ ہلاکت زندگی کی تحقیر اور الٰہی امانت میں خیانت ہے۔

فلسفۂ شہادت کو اختیار کرنے والا جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ اسے اپنا امتحان سمجھتا ہے۔ وہ اس کا مقابلہ صبر و صلوٰۃ کے ہتھیاروں سے کرتا ہے۔ اس کے عمل میں استقامت اور اللہ سے خضوع و خشوع بڑھ جاتا ہے۔ "اور ہم تمھیں کچھ خوف سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں سے اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے۔ اور ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑی تو انھوں نے کہا کہ ہم تو خدا ہی کے ہیں اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ خوشخبری دے دو کہ انھیں لوگوں پر ان کے پروردگار کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

فلسفۂ شہادت کو اختیار کرنے والا اپنے اللہ پر توکل کرتا ہے۔ اسبابِ ظاہری مہیا ضرور کرتا ہے کہ یہ بھی جہاد کی تیاری ہے لیکن ان پر بھروسہ نہیں کرتا۔

کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

شہید کا کام نتائج سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض پورا کرنا ہے، وہ کامیابی کی دیوی کا پجاری نہیں ہوتا، بڑا بنیادی فرق ہے ان دو آدمیوں میں جن میں ایک وہ ہے جو کسی مقصد کے لیے سعی کرتا ہے خواہ وہ مقصد کتنا ہی بلند اور ارفع کیوں نہ ہو اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر ذریعہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہے خواہ وہ کتنا ہی پست اور مذموم کیوں نہ ہو، اور دوسرا وہ ہے جو ایک بلند مقصد کے متعلق ہر موقع پر اپنے فرض کو سمجھنے اور اس کو پورا کرنے کی سعی کرتا ہے اور نتائج کو خدا پر چھوڑتا ہے۔ پہلا راستہ عقلِ سفلی کا ہے، مکاریوں اور مصلحت بازیوں کا ہے۔ دوسرا راستہ عقلِ علوی کا ہے، ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ پہلے راستے میں اگر کامیابی بھی حاصل ہو جائے تو وہ حقیقی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اچھے سے اچھے مقصد کو برے ذریعہ مسخ کر دیتے ہیں۔ دوسرے راستے میں اگر بظاہر شکست بھی ہو تو کامیابی ہے، کیونکہ ہر بیج جو اللہ کے بتائے ہوئے طریق پر بویا جائے اپنا پھل ضرور لاتا ہے۔

شہید کی کامیابی اتفاقی نہیں یقینی ہے۔ خود اس کے عمل میں کامیابی موجود ہے۔ پہلی کامیابی تو یہ ہے کہ اس نے اپنا فرض پورا کیا اور اپنا وہ عہد پورا کیا جو اس نے اپنے اللہ سے کیا تھا اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کر دی۔ دوسری کامیابی یہ ہے کہ جب بندے نے اپنا عہد پورا کر دیا تو اللہ تعالیٰ پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کرے اور اس سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے، تمام "خیر" اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ موت میں سے زندگی پیدا کرنے والا وہی ہے جو زندگی میں سے موت پیدا کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ جس مقصد کی خاطر شہادت پیش کی گئی ہے اس کی تکمیل نہ ہو۔ اور تیسری کامیابی وہ ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ "اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے تم ان کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں گو کہ تم اپنے حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵

حق اور باطل کا قرآنی تصوّر

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کی ذات حق ہے۔ حق اس کو کہتے ہیں جو قائم رہنے والا ہو، ثابت ہو، واقعہ کے مطابق ہو، جس کا وجود لازم اور واجب ہو، اور وہ اللہ کی ذات ہے، کلامِ پاک میں جگہ جگہ رَبّکُمُ الحق، مولاھم الحق، الملك الحق، ان اللہ ھوالحق، ھوالحق المبین کا ذکر ہے، وہی رب حق ہے، وہی ملک حق ہے، وہی الٰہ حق ہے، وہی پالن ہار ہے، اس کا حکم چلتا ہے، وہی حمد اور عبادت کا سزاوار ہے۔

نہ صرف ان اللہ ھوالحق المبین بلکہ الحق من ربھم بھی ہے۔ اللہ حق ہے، جو کچھ اس کی طرف سے ہے حق ہے، حق محض وہی ہے جو اس کی طرف سے ہے، سب حق اس کی طرف سے ہے، اس کی طرف سے کتاب کی تنزیل ہے۔ اس کی طرف سے انبیاء کی ترسیل ہے، اس کی طرف سے کائنات کی تخلیق ہے، تکوین اور تشریع اور تنزیل اسی کی طرف سے ہے اور یہ سب حق کے ساتھ ہیں۔

کتاب میں آیاتِ الٰہی ہیں، عقائد ہیں، قصص ہیں، احکام ہیں، اللہ کے وعدے ہیں، کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ اہلِ ایمان کا قلب گواہی دیتا ہے کہ وہ حق ہے، اہلِ کتاب بھی جانتے ہیں کہ یہ پچھلے صحیفوں کی جو ان کے پاس ہیں تصدیق کرنے والی ہے، اور حق ہے، شریعت کے احکام میں مصلحتِ وقت سے کچھ تبدیلی ہے، لیکن حقیقت یعنی معرفتِ خدا اور خلوصِ نیت کے ساتھ اپنے حال اور معاملہ کی صحت و اصلاح وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ کافر حق کو کہتے ہیں کہ یہ محض شاعری ہے، کہانت ہے، جادو ہے۔

کسی چیز کے متعلق وہی اعتقاد رکھنا کہ جیسی کہ وہ نفسِ واقع میں ہے حق ہے۔ شروع میں حق عدل کی صورت میں ہے۔ ہر انسانی تعلق کے حقوق و فرائض کو متعین کر کے حق اور باطل میں فرق کر دیا گیا ہے۔ ہمارے مال میں سائل اور محروم اور ذوالقربیٰ کا حق ہے۔ بغیر حق کے کسی کی جان لینا خواہ وہ اللہ کا نبیؐ ہو یا بندہ کافر ہو یا دوسرے

کا مال اور حصہ غصب کرنا، یا اللہ کی زمین میں فساد اور بغاوت پھیلانا ناحق ہے۔ باطل ہے، ظلم ہے ؎

بے حکم شرع آب خوردن خطاست
وگر خون بفتویٰ بریزی رواست (سعدی)

کتاب میں جو قصص ہیں وہ حق کے ساتھ اتارے گئے ہیں، جس کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ لغو اور بے معنیٰ نہیں ہیں۔ لہوالحدیث نہیں ہیں بلکہ ان میں حکمت و موعظت ہے، ان میں اسرار و حقائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کیے ہیں وہ حق ہیں، موت حق ہے، معاد حق ہے، قیامت حق ہے، میزان حق ہے، جزا و سزا حق ہے اور شہود حق حق الیقین ہے، حق وہ ہے جو اسی طرح واقع ہو اور اسی وقت اور اسی مقدار میں واقع ہو جس طرح اور جس وقت اور جس مقدار میں اس کا واقع ہونا واجب و لازم ہے۔

اسی سے اپنے نفس کے حق پیدا ہوئے، عباد اللہ کے حق پیدا ہوئے، اپنے نفس کا حق یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے بچاؤ، کفر نفس کی ہلاکت ہے، اللہ کے راستہ میں بذلِ مال میں بخل کرنا ہلاکت ہے، میدانِ جہاد سے بھاگ جانا ہلاکت ہے۔ عباد اللہ کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ عدل و احسان کا سلوک کیا جائے۔ اللہ کا حق جاھدوا فی اللہ بھی ہے اور جاھدوا فی سبیل اللہ بھی ہے۔ یعنی معرفتِ الٰہی میں بھی جد و جہد کرو اور احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں بھی جد و جہد کرو۔ اس سے ڈرو جو حق ڈرنے کا ہے، اس کی قدر کرو جو حق قدر کرنے کا ہے، یعنی اپنے تمام خوف اور امیدوں کو اسی سے وابستہ کرنا حق ہے۔ یہ کتاب حق کی طرف ہدایت کرنے والی ہے، اگر کوئی شخص اخلاصِ نیت کے ساتھ، طلبِ ہدایت کی تڑپ کے ساتھ کہ وہ تقویٰ کی ابتدائی منزل ہے، اس کتاب سے تمسک کرتا ہے تو اس کی حق کی طرف ہدایت ہوتی ہے، اگر کوئی شخص اپنے اغراض و مطالب کو اس کتاب کے کلمات میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اس کو یہ کتاب گمراہ کرتی ہے۔ بغیر سند کے اللہ تعالیٰ پر باتیں جوڑنا یا دین میں غلو کرنا غیر حق ہے۔

جس طرح تنزیلِ کتاب اور تشریعِ حق ہے۔ اسی طرح تکوینِ کائنات حق ہے، از روئے کتاب قولِ کن سے کائنات میں تخلیق کا عمل جاری و ساری ہے: وقولہ الحق۔ اور اس کا قول حق ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ ارض و سماوات اور ان کے بیچ میں جو کچھ ہے اس کو حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے دو معنی صریحاً سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وجودِ فاعل اور مطلق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کائنات کا وجود مقید اور منفعلہ ہے۔ کہ اس میں وجود کی قابلیت اللہ تعالیٰ کے فیض اور تجلّی ہی کا اثر ہے، اور دوسرے معنی یہ کہ اس کائنات کو ایک حکمت اور مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ محض بے مقصد اور بے معنی پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے دنیا کو باطل نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک قول ہے کہ "الآخرۃ حقیقۃ والدنیا باطلۃ"، آخرت حقیقت ہے اور دنیا باطل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس فیض اور تجلّی سے یہ دنیا پیدا ہوئی ہے، جس حکمت کے لیے یہ پیدا کی گئی ہے، اور اس دنیا سے جو کچھ انسان آخرت کے لیے کسب کرتا ہے وہ تو اس کی حقیقت ہے، اور محض وہی حقیقت ہے، باقی سب باطل ہے، دھوکا ہے، فانی ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝

اور کتاب کی تنزیل اور کائنات کی تکوین کے ساتھ ساتھ رسولؐ کو بھی حق کے ساتھ بھیجا گیا، اور یہ حق محض وہ کتابِ حق ہی نہیں جو اس پر نازل کی گئی بلکہ وہ طاقت اور اختیار وہ امر اور حکم، وہ سند اور سلطان، وہ اتھارٹی ہے جس کے ساتھ اس کو لوگوں کو خوشخبری دینے اور ڈرانے کے لیے، ان کے تزکیۂ نفس کے لیے، کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لیے دعوت الی الحق کے لیے، تمام ادیانِ عالم پر دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ حکومت کی وہ طاقت ہے جو حکومت کے چھوٹے بڑے کارندے کی پشت و پناہ ہوتی ہے اور جو اس کے قول میں اعتبار اور عمل میں وزن پیدا کرتی ہے، اور اس کو سب لوگوں کی عزت و توقیر و طاعت کا حقدار بناتی ہے

مختصراً

حق ہدایت ہے، اس کا تضاد گمراہی اور ضلال ہے۔ "اور وہی تمھارا اللہ ہے" اور

تمھارا رب سچا تو حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا ہے۔

تشریعی اعتبار سے حق عدل ہے اس کا تضاد ظلم ہے۔

معرفت کے اعتبار سے حق یقین ہے جو تمھارے سمع اور بصر اور قلب کی ذمہ داری ہے۔ اس کا مقابل اور تضاد ظن اور گمان اور شک ہے۔

حق امرِ الٰہی ہے، اس کا تضاد تمام طاغوتی طاقتوں کا جادو ہے۔

حقیقت کے اعتبار سے حق ثابت و قائم ہے۔ اس کا تضاد باطل ہے جو بے حقیقت، خلافِ واقع اور ناپائیدار ہے۔

باطل کا نہ مبدا ہے نہ معاد ہے، یہ نفسِ انسانی کا دھوکا ہے۔ قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کی ہوا اور نفسانی خواہشات، اس کا حسد اور اس کا تکبر ہیں، جو حق اور باطل میں التباس اور اشتباہ پیدا کرتے ہیں اور کتمانِ حق کے ذمہ دار ہیں۔

اور یہ حق اور باطل کا کھیل اس لیے چل رہا ہے کہ موت و حیات کی اس گھاٹی میں ایمان رکھنے والے اور نیک عمل کرنے والے صبر و استقلال سے حق کو پکڑ کر گھاٹے اور نقصان سے بچ سکیں اور حق و باطل کے ٹکراؤ سے حق اور زیادہ ثابت ہو اور زیادہ نکھر جائے اور باطل دھوئیں کی طرح چھٹ جائے، اس لیے کہ بے حقیقت باطل کی تو فطرت ہی میں مٹنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے۔

نفع اور ضرر صرف اللہ کے اختیار میں ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر ذی حیات میں نفع حاصل کرنے کی اور مضرت کو دُور کرنے کی ایک فطری صلاحیت رکھی ہے اور حیوانات و نباتات سبھی ان عوامل اور اثرات کو جو ان کی بقا میں مددگار ہیں جذب کرتے ہیں اور جو مُضر ہیں ان سے مدافعت کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے، سننے، سوچنے، سمجھنے کی طاقتیں عطا کی ہیں اور عقل و شعور کی نعمتوں سے نواز کر اس پر بڑی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں۔ انسان اپنا نفع نقصان سمجھنے میں غلطی بھی کر سکتا ہے، وہ ان چیزوں سے کراہت کر سکتا ہے جن میں اس کا فائدہ ہے۔ وہ اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے وقتی لذات کی خاطر اپنے حقیقی مفاد کو قربان کر سکتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے ظاہری زیب و زینت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ اپنی فطرت کی کمزوری اور جلد بازی سے اکثر مقامات پر اس کے قدم میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ انکار بھی کر سکتا ہے اقرار بھی کر سکتا ہے۔ کافر بندہ بھی ہو سکتا ہے، شکر گذار بندہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت ہے کہ اس نے انسانی شعور کی تربیت کے لیے اور انسانی عقل کی رہنمائی کے لیے وحی کے ذریعہ ہدایت کا سلسلہ قائم کیا۔ تمام ہدایت اللہ ہی کی طرف سے ہے، خواہ کسی کو اس کی معرفت ہو یا نہ ہو۔ اللہ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے وہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، ہاں پکارنے والا ان کو پکار کر اپنا ضرر کرتا ہے۔ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی فلاح کا راستہ ہے، اور فلاح، دنیوی اور اُخروی سعادت اور کامیابی پر حسنۃ الدنیا اور حسنۃ الآخرۃ پر محیط ہے۔ دنیوی فلاح یہ ہے کہ بھوک سے سیری اور خوف سے امن حاصل ہو۔ سیاسی اور سماجی اعتبار سے ذلت اور معاشرتی اعتبار مسکنت اللہ کے غضب کی نشانیاں ہیں۔ اخروی فلاح اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے گویا فلاح انسان کی اپنی مراد کو پہنچنا ہے، اور قرآنی اصطلاح میں فلاح یا خیر ہی انسان کے لیے نفع ہے اور اس سے محروم رہنا ضرر ہے۔

قرآنِ حکیم میں تذکیر کا ایک پیرایہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان ہے، نظامِ فطرت اور تسخیرِ عناصر سے لے کر نباتات و حیوانات سب میں انسان کے لیے نفع ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے آداب و حدود کا لحاظ رکھا جائے۔ یہ سب منافع اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

ایک انسان دوسرے انسان کی خدمت کر سکتا ہے، برائیوں کو روکنے کی نیکی کو پھیلانے کی سعی کر سکتا ہے، ذکر و نصیحت کر سکتا ہے جو کہنے والے اور سننے والے دونوں کے لیے اچھی بات ہے، لیکن ایک پیغمبر کی کوشش اور ارادے کے باوجود یہ بات لازمی نہیں ہے کہ ہر سننے والا اس سے فائدہ حاصل کرے گا۔ اسی طرح یہ صحیح ہے کہ دنیا دارالاسباب ہے اور انسان کا انسان سے کام نکلتا ہے۔ اور کسی کے احسان پر اس کا شکر ادا نہ کرنا کفر ہے۔ اور ناشکری کی ایک قسم ہے، لیکن کسی اللہ کے بندے کی خدمت کرنے کے لیے ترغیب و تحریص کا پیدا ہونا اللہ ہی کا فیض و کرم ہے اور اپنے ہی جیسے محتاج بندے کو رازق اور قاضی الحاجات سمجھنا شرکِ صریح ہے۔ اور شرک سے بڑھ کر ضلالت و ذلت انسان کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک کسی کو ضرر پہنچانے کا تعلق ہے تو یہ ظالم کا گمان ہے کہ وہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ ایک انسان کا تصرف زیادہ سے زیادہ دوسرے انسان کے جسم تک ہو سکتا ہے اور وہ اس مغالطہ میں پڑ سکتا ہے کہ وہ جسے چاہے مارے اور جسے چاہے چھوڑے لیکن انسان کے قلب و روح تک کسی کی دسترس نہیں۔ اور نفع اور ضرر کا تعلق حقیقت میں انسان کے نفس سے ہے جس کا مالک اللہ ہے اور جس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ بیشک ظالم کے ظلم سے بچنے میں احتیاط انسب ہے۔ اور ظلم کو دفع کرنے کی سعی ہمارا دین ہے، اور ہماری دعا یہ ہے کہ ہم دشمنوں اور ظالموں کیلیے تختۂ مشق اور فتنہ و امتحان نہ بنیں لیکن اگر ہم صراطِ مستقیم پر ہیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور ہدایت پر ہیں تو دشمنوں کے ضرر پہنچانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ وہ کچھ اذیت پہنچا سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ بھی بالآخر ہمارے حق میں مفید ہی ہوگا۔ ان کی مکاری کا جواب صبر اور تقویٰ ہے۔ حکمت کی انتہا یہ بصیرت ہے

کہ اصول پرستی ہی سب سے کامیاب پالیسی ہے اور امانت و دیانت ہی سب سے بڑی ذہانت ہے۔ کافر کے مکر و فن اور مومن کی فراست میں یہی فرق ہے۔

تم سوچو کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تمام ترکیبیں کامیاب ہو جائیں گی۔ ایک آدمی جو حق پر ہے اور وہ بظاہر ناکام ہو جاتا ہے۔ پھر بھی نفع میں ہے کہ وہ ایک امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن وہ شخص جس نے اپنے سب اصول، اپنی غیرت اور ایمان ایک وقتی مفاد کی خاطر داؤں پر لگائے اور پھر وہ ناکام رہا تو اُس کے لیے سوائے خودکشی کرنے کے اور کیا چارہ ہے، اسی کو خسرۃ الدنیا والآخرۃ یعنی دنیا اور آخرت دونوں کا نقصان کہتے ہیں اور اگر وہ کامیاب بھی ہو گیا اور ملک و عزت بھی حاصل کر لی تو چونکہ یہ ملک و عزت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نہیں ہے اس لیے یہ بے حقیقت ہے۔ ہر مقصد ان ذرائع کا تابع ہوتا ہے جن سے وہ مقصد حاصل کیا جائے۔ اس کامیابی میں بھی سوائے ضرر کے اور کچھ نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم میں ان تمام باتوں کا ذکر ہے جن کو عام طور پر منافع کی نشانیاں، اور کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ زیب و زینت اور آرائش، مال و اولاد میں کثرت ایک دوسرے پر مفاخرت عورتوں اور اولاد کی خواہش، اپنے جتھے اور گروہ کی طاقت و کثرت، سونے چاندی کے ڈھیر جمع کیے ہوئے ہے، مال گھوڑوں کے اصطبل، چوپائے، کھیتی باڑی، تجارت جس کے خسارہ سے ڈر لگتا ہے، مکانات جن کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو جائے، قرآنِ حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ یہ بذاتِ خود نفع کی چیزیں نہیں ہیں، ان سے نفع بھی کمایا جا سکتا ہے اور ان سے ضرر بھی ہے۔ مال کی محبت میں بخل اور اسراف میں ضرر ہے، سود میں تباہی ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی ہے اس کو حلال طریقوں سے کمانا اللہ کے فضل کی تلاش ہے، اور اس سے حقوقِ عباد کو پورا کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ کو قرض دینا بڑے منافع کا سودا ہے۔ اولاد اور بیوی، اور مال انسان کا امتحان ہے، اگر ذرا احتیاط نہ برتی گئی تو ضرر کا باعث اور گھاٹے کا سودا ہے۔ اگر ان چیزوں کو مقصدِ حیات سمجھا گیا تو یہ ضرر ہے، اگر ان کو متاعِ حیات سمجھا گیا تو ان میں بہت فائدہ ہے۔ نفع

نفع اس میں ہے کہ انسان اپنے تمام تعلقات میں عدل سے کام لے خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ظلم سے کمائے ہوئے فائدے میں سراسر ضرر ہے۔

پس اس حقیقت کا کہ نفع اور ضرر صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنے نفع اور ضرر کو سمجھنے میں اپنی خواہشات کی نیرنگ سازیوں سے دھوکا نہ کھائے یہ دھوکا فسق و فجور ہے اور اپنا نفع اور ضرر ان چیزوں میں سمجھے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور جن کی قلبِ سلیم تصدیق کرتا ہے۔ پھر نفع حاصل کرنے کی اور ضرر سے بچنے کی حتی الامکان سعی کرے، اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ انسان کے لیے نہیں ہے مگر جو اس نے سعی کی ہے وہ اپنی سعی کے اتمام اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑے، جو راہی اپنی سمت ٹھیک کر لیتا ہے اور یقین منزل تک پہنچانے کا اللہ تعالیٰ پر چھوڑتا ہے۔ وہ سب سے دُور تک جاتا ہے اور سب پر سبقت کرتا ہے۔ انسان کو یہ دیکھنے کے لیے بہت کم نظر دی گئی ہے کہ اس کے کسی اقدام کے تمام عواقب و نتائج کیا ہوں گے۔ لیکن یہ ہدایت ضرور کی گئی ہے کہ کیا اقدام اس کے لیے فرض اور مستحب ہے۔ پس نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ کر اپنے فرض کی بجا آوری ہی انسان کی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ یہی توکل ہے، یہی تقاضائے عبدیت ہے، اللہ کے رسولؐ کی شانِ عبدیت یہ ہے کہ وہ کہے کہ میں اپنے نفس کے لیے نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں یہ اللہ کے ارادے اور منشاء پر منحصر ہے۔

دین میں فرقہ بندی

① توحید اور وحدتِ ملّت

دینِ اسلام کا اصلِ اصول عقیدۂ توحید ہے، اللہ تعالیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے رشتے کے متعلق، رسولوں کے ذریعے اس کے نظامِ ہدایت اور جزا و سزا کے متعلق حقیقت کی دریافت اور تسلیم کرنا ایمان ہے، اس ایمان سے زندگی کی سمت، اس کے مقصد، اس کے معنی اور اقدار بدل جاتے ہیں۔ عقیدۂ توحید کا فطری اور لازمی تقاضہ وحدتِ ملّت ہے، قرآنِ حکیم نے اسی عقیدہ پر تمام اہلِ کتاب کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی۔ قرنِ اوّل کے اسلامی معاشرہ میں جو وحدت و اخوّت، عدل و احسان کی قدریں بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کا باعث قرآنِ حکیم نے اس عقیدہ کو زبان اور قلب و عمل سے تسلیم کرنے کو قرار دیا ہے۔ عربِ جاہلیہ کا معاشرہ قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ کا بُت جدا تھا۔ اپنے قبائلی بتوں سے ان کا یہ سمجھوتہ تھا کہ وہ ان کی مروجہ رسوم کے مطابق پرستش کریں گے اور وہ بت تمام قبائلی جھگڑوں میں جن کی بنیاد جاہلیت کی عصبیت اور حمیت پر تھی، اپنے پوجنے والے قبیلہ کی حمایت کریں گے۔ اس معاشرتی کیفیت کو قرآنِ حکیم نے آگ کے گڑھے سے تعبیر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وحدت کا سماں جو پیدا ہوا ہے اس کی وجہ کوئی مالی منفعت نہیں ہے، یہ نہیں ہے کہ ان کو مال دے کر خریدا گیا ہو بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عملاً ملازمت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے دل محبّت کی بندشوں میں جکڑ دیئے۔

ایمان اور عمل کا ساتھ ہے، ایمان عمل ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ عمل ہی ایمان کا شاہد ہے، اور ایمان کو تقویت پہنچاتا ہے، اس عمل کے پروگرام سے فرد میں اور معاشرہ میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوتا ہے۔ اس لائحہ عمل کی حیثیت دین کے ارکان

اور ستون کی ہے۔

ایمان اور عمل کے اشتراک سے ملت میں وحدت پیدا ہوتی ہے ——

۲ فرقے یا دینی روایات

دین کی تاریخ کا پہلا دَور انقلابی دَور ہوتا ہے۔ اس دَور میں دین کا انقلاب آفرین مقصد لوگوں کے ذہن و قلوب پر چھایا رہتا ہے اور وہی ان کے باہمی اور مشترک عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسانوں کے مزاج، ان کی طبیعتوں کے رجحان، انکے فہم کی صلاحیت اور استعداد مختلف ہوتی ہے، اور اسی مناسبت سے قلوب و اذہان پر دین کے تاثر کا رنگ و آہنگ مختلف ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلافات نشرِ دین میں نئی ابعاد پیدا کرتے ہیں، اس کی زیب و زینت اور اس کی وسعت و گہرائی میں اضافہ کرتے ہیں، اور چونکہ دین کے اصول و مقاصد میں ایمان اور عمل میں اشتراک ہوتا ہے، اس لیے یہ اختلافات کسی انتشار یا تصادم کا باعث نہیں بنتے۔

دوسرا تاریخی دَور وہ ہوتا ہے جب یہ انقلاب دنیوی اعتبار سے کامیاب ہو جاتا ہے، کامیابی کی منزل جدو جہد کی منزل ہے، زیادہ سخت امتحان ہے، اس منزل پر بہت سے شکست خوردہ اور کامیابی کے پرستار عناصر ملت میں داخل ہو جاتے ہیں اور منافقت کا زہر پھیلاتے ہیں۔ سیاسی اقتدار اور معاشی مفادات کی خاطر کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کے ارادے اور طور طریقے بھی بدل جاتے ہیں، اور حالات کے دباؤ سے مصلحت اندیشیاں اور مصالحت کوششیاں بھی دین میں شامل ہو جاتی ہیں۔ کچھ نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسانی دماغ کی یہ فطری کمزوری ہے کہ ماحول اور مفادات کا اثر انسانی سوچ پر بھی پڑتا ہے اور چونکہ معاشرے میں دین کی حیثیت قدرِ اعلیٰ کے طور پر مسلّم ہوتی ہے، دین کی تعبیرات میں انسانوں کے فطری اور ذہنی اختلافات کے ساتھ ساتھ ماحول اور مفادات کے اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ مباحثِ دین میں کلام و فلسفہ کی موشگافیاں ناگزیر

طور پر شامل ہو جاتی ہیں، انقلاب ایک تہذیب کو پیدا کرتا ہے اور دین بجائے ایک عمل انگیز محرک کے علمی و فکری روایات میں شاخ در شاخ ہو جاتا ہے اور ہر روایت میں کچھ عظیم ہستیاں ائمہ کی حیثیت میں مستحکم ہو جاتی ہیں۔

وہ فرقہ یا دینی روایت جس کا تاریخی سلسلہ بلا انقطاع محمد مصطفیٰؐ تک پہنچتا ہے معتبر ہے، فرقہ یا روایت کو قائم کرنے کی وہ کوشش جو اس تاریخی سلسلہ کو نظر انداز کر کے بزعمِ خود "دینِ مصطفیٰؐ" کی تجدید کی دعویدار ہو غیر معتبر ہے۔ ہر روایت کا اپنا مزاج ہے، اجتہاد و تجدیدِ دین کی معتبر روایات کے اندر ہی ممکن اور مستحسن ہے، روایت سے آزاد تجربہ "ایجادِ بندہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔

③ فرقہ بندی

ان تضادات اور تنازعات کے دوران کچھ شدید محبتیں اور نفرتیں ابھر آتی ہیں۔ کچھ ذیلی رسوم و عقائد مستقل ہو جاتے ہیں۔ کچھ خوف اور تعصبات نسلاً بعد نسلٍ سخت اور جامد ہو کر فکر کا انداز بن جاتے ہیں۔ یہ سب ایک فرقہ کا حصار بن جاتی ہیں، جس کے پیچھے ہر فرقہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر خوش رہتا ہے، اور اختلافات کی خندق کو وسیع اور گہرا بناتا جاتا ہے۔ خود کو نجات یافتہ اور باقی سب کو گمراہ سمجھتا ہے۔ زبان سے دہرائے ہوئے کچھ عقائد اور کچھ ذیلی رسوم کی ادائیگی دین کے اصول و مقاصد تک پہنچنے کی بجائے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ سورج کی روشنی ان چھوٹی چھوٹی دیواروں سے رک جاتی ہے جو انسان اپنے چاروں طرف کھڑی کر لیتا ہے۔ حقیقت کی تلاش مناظروں کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور قرآن و حدیث کا زیادہ تر مصرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان سے اپنے موقف کی تائید حاصل کی جائے۔

ایسی صورت میں ایک خاص قسم کی دینی لیڈر شپ ابھرتی ہے، جس کی بنیاد ہی اپنے آپ کے متعلق فخر اور اطمینان کا جذبہ اور دوسروں سے خوف اور نفرت کا جذبہ ابھارنے پر ہوتی ہے۔ جاہلوں کو یہ بات بہت پسند ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر

اصلاح کے نام پر فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اصلاح کے نام پر ایک تحریک شروع ہوتی ہے۔ اور اس میں اس عجز و انکسار کی بجائے جو اپنی اور دوسروں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے تکبّر اور پندار پیدا ہونے سے وہی تحریک ایک اور فرقہ بن جاتی ہے۔ اور نتیجہ بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے، اکثر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ جتنی مذہبی جذبہ کی کمی ہوگی اتنا ہی فرقہ بندی کا رجحان شدید ہوگا کیونکہ یہی فرقہ بندی کا رجحان صحیح مذہبی جذبہ کی جگہ لے لیتا ہے۔

۴ اللہ کی رسّی

اب اس صورت میں مرورِ زمانہ سے مختلف مکاتیبِ فکر کا پیدا ہونا اور مکاتیبِ فکر بن جانا ناگزیر تاریخی عمل ہے۔ فرقہ بندی کی لعنت کو ختم کرنے کی کیا تدبیر کی جا سکتی ہے۔ فرقوں کا پیدا ہونا فطری اور تاریخی عمل سہی لیکن فرقہ بندی شرک ہے۔ ظاہر ہے کہ فرقوں کو ختم کرنا نہ ممکن ہے نہ مستحسن ہے، بلکہ اس کوشش کا نتیجہ ایک اور فرقہ پیدا کر کے فساد کو اور بڑھانا ہے۔ فرقہ ختم کرنا تو ناممکن ہے لیکن ہر فرقہ کے آدمی کا فرقہ بندی سے بلند ہونا ممکن ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے تو قرآنِ حکیم کے ذریعہ اہلِ کتاب کو یہ دعوت دی تھی کہ جزوی اختلافات کو چھوڑ کر اس کلمہ پر متفق ہو جائیں جو ہمارے تمھارے درمیان یکساں ہے کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کو رب بنائیں۔ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے کہ مومن ہوں یا یہود و نصاریٰ ہوں یا صابی ہوں جو اللہ اور یومِ آخر میں ایمان رکھتا ہے اور عملِ صالح کرتا ہے، اس کا اجر اس کے اللہ کے پاس ہے اور اس کے لیے کوئی خوف و حزن نہیں ہے، وہ لوگ جن کا قبلہ مختلف شرع اور منہاج مختلف تھا، ان کو بھی یہ ہدایت تھی کہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے وہ تمھارا امتحان ہے، نیکی کی طرف سبقت کرو، سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو وہ تمھیں بتا دے گا۔ تو جب غیر مذہب والوں سے اصل دین پر اشتراک و اتحاد ممکن ہے تو دینِ اسلام کے مختلف فرقوں میں جو تمام اللہ کے

ماننے والے، محمدؐ رسول کے نام لیوا ہیں اور قرآن وحدیث سے اپنی سند حاصل کرنے والے ہیں، اتحاد واخوت بدرجۂ اولیٰ ممکن ہے۔ بات وہی ایمان اور عملِ صالح کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام اختلافات مذاہب میں دین کے سررشتہ کو گم نہ کیا جائے، بلکہ اپنے مذہب کو اصل اصولِ دین تک پہنچنے کا راستہ سمجھا جائے۔

بمصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

بیشک اگر مصطفےٰؐ تک ہی نہیں پہنچے تو تمام سُنّیت اور شیعیت سوائے بولہبی کے اور کیا ہے؟ سنّی اور شیعہ سب اچھے مسلمان بننے کا بہانہ ہے، اور مسلمان بننا انسانیت کی معراج ہے۔ حافظ شیرازیؒ نے فرقوں کے متعلق لکھا ہے۔ ؎

جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ہاں! حقیقت تک پہنچنے کی کوشش میں افسانے بھی بن جاتے ہیں۔ عذر یہ ہے کہ شاید حقیقت تک پہنچنے کا راستہ افسانوں ہی میں ہو کر گذرتا ہے۔ لیکن افسانوں میں حقیقت کو گم کرنا اندھا پن ہے تو پہلی ضرورت تو اسی گہرائی کی ہے سطحی باتوں سے گذر کر گہری حقیقت تک پہنچنے کی ہے۔ اور دوسری ضرورت جو اسلام کا معاشرت میں مقصدِ اولیٰ ہے۔ صلوٰۃ وزکوٰۃ کو قائم کرنا، توحید اور عدل واحسان کو رائج کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرنا، غرض غلبۂ اسلام میں عملاً شرکت کرنا ہے کہ یہی اللہ کی رسّی ہے۔ ہر انقلاب پیہم انقلاب سے زندہ رہتا ہے، اور اشتراک فی العمل تمام اختلافات کو دبا دیتا ہے اور ان کو اپنی حد میں رکھتا ہے۔

یہ دونوں تدبیروں کو قرآنِ حکیم میں الامر میں تنازعہ نہ کرنا اور اللہ کی رسّی کو مل کر مضبوط پکڑنے کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جب تک فکر وعمل میں یہ انقلاب نہیں آتا، اسوقت تک تمام قول وقرار، تمام عہد وپیمان اور ضابطے اور آئین بیکار ہیں۔

دورِ حاضر میں مذہب سے بیگانگی

شاید ہی کوئی زمانہ ایسا ہو جس میں بہت خلوص اور نیک نیتی سے یہ شکایت نہ کی گئی ہو کہ دورِ حاضر مذہب سے بیگانہ ہے۔ حضورؐ کے عہدِ مبارک کو چھوڑ کر مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں تم بزرگوں کو یہ شکایت کرتے پاؤ گے کہ سلفِ صالحین کو دین سے کتنا شغف تھا اور ان کی ہم عصر نسل کس طرح دین سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ صحابہ اور تابعین و تبع تابعین میں بھی ترتیب رکھی گئی ہے۔ حضورؐ سے ایک حدیث بھی اس مضمون کی منسوب ہے۔ کہ سب سے اچھا میرا عہد ہے۔ اس کے بعد تدریجی انحطاط کے دور ہیں۔ ادیان کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ پیچھے آنے والی نسلوں نے اگلی نسلوں کے ایمان و عمل کے راستہ کو ضائع کر دیا۔ مسلمانوں میں ایک روایت مشہور ہے کہ خاتم الانبیاؐ کی امت میں ہر صدی میں کوئی مجدد ہوتا ہے۔

تاریخی تناظر کو صحیح رکھنے کے لیے یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ یہ شکایت اسی دور سے مخصوص نہیں ہے۔ اجتماعی نفسیات کی حقیقت یہ ہے کہ دین کیلیے وہ جذبہ اور شغف جو قرنِ اوّل میں ہوتا ہے جب ایک دین ایک عظیم انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بہت دن تک اسی شدت سے قائم نہیں رہتا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک ملت اپنی تاریخ کے مختلف ادوار سے گذرتی ہے اور زندگی کے شعبے اور نظام تقسیم کار بدلتا ہے۔ سماجی اور معاشی رشتے بدلتے ہیں، اور ان کا اثر ملت کے اجتماعی شعور پر بھی پڑتا ہے۔ اسی لحاظ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین کا عمل بھی مختلف ہوتا ہے۔ تاریخِ اسلام میں تصوف کا عروج و فروغ اسی خیال کی نشان دہی کرتا ہے۔ ویسے دنیا کا قدیم سے قدیم مذہب بھی ختم نہیں ہوتا کسی نہ کسی صورت میں موجود ضرور رہتا ہے۔ صحیح اور بامعنی سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر کے شعور اور طرزِ احساس کا مذہبی روایت اور تجربہ سے کیا تعلق ہے۔ اور اس وسیع اور مبہم موضوع کی مناسب حد بندی یہ ہے کہ دورِ حاضر میں

بھی اپنے ہی معاشرہ پر غور و فکر کیا جائے۔

مغرب میں مذہب کلیسائی ادارہ سے وابستہ تھا، اس ادارے کے خلاف احتجاج نے مذہبی اصلاح کی صورت اختیار کی، مذہبی اصلاح سے تعصبات اور تشدد اور خونریز جنگیں پیدا ہوئیں۔ اس صورتِ حال کے ردِّ عمل کے طور پر مغربی تہذیب میں قومیت یعنی مکانی حدود میں اجتماعی انسانی طاقت کی پرستش، اور عقلیت اور انفرادیت یعنی خود پرستی کے رجحانات سترھویں صدی بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے ایسے نمایاں ہوئے جن کا عمل دانستہ یا نادانستہ طور پر مذہب کی روح یعنی خدا پرستی کے خلاف تھا اور جن کے زیرِ اثر سائنس کا مقصدِ وحید ٹیکنالوجی ہو گیا۔ جب ہمارے معاشرہ پر مغرب کا تسلط شروع ہوا تو مغربی سامراج ٹیکنالوجی کی طاقتوں سے لیس تھا اور مذہب سامراج کے حلیف کے طور پر اس جارحیت میں شریک تھا۔ اگر ان مسلمان مبلغین کا مقابلہ جو مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ بلکہ ان سے بھی پہلے برِصغیر ہندوپاک میں آئے، ان عیسائی مشنریوں سے کیا جائے جو مغربی قسمت آزما سپاہیوں اور نفع اندوز تاجروں کے ساتھ آئے اور ان کے عزائم اور طریقِ حیات اور طریقِ کار کو نظر میں رکھا جائے تو یہ مطالعہ بہت سبق آموز اور عبرت انگیز ہوگا۔

جس وقت مغربی تہذیب کی یہ یورش شروع ہوئی اس وقت ملّتِ اسلامیہ کی داخلی، اخلاقی اور روحانی مدافعت کی صلاحیتیں کمزور پڑ چکی تھیں۔ عیسائیت کے اس جارحانہ حملہ کا ردّ تو بخوبی ہو گیا لیکن مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے زیرِ اثر ایک مذہبی اصلاح کی تحریک بھی شروع ہو گئی۔ اس میں کوشش یہ کی گئی کہ تاویل کے ذریعہ مذہب سے "غیب" کا عنصر خارج کر دیا جائے، حالانکہ ہدایت کی شرطِ اوّلین ایمان بالغیب ہے۔ اور مذہب کو عقلیت کے سانچہ میں ڈھالا جائے یعنی مذہبی عقیدوں کو وقتی اور انفرادی عقل کی مفروضات اور مزعومات کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس کوشش کے ہمیشہ دو درجے ہوتے ہیں، پہلے درجہ پر تو یہ ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ مذہب عقل کے مطابق ہے، دوسرا درجہ یہ آتا ہے کہ جب ایسا ہے تو مذہب کی

کیا ضرورت ہے عقل ہی کافی ہے، مرعوبیت کے زیر اثر یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلامی احکام مغربی یورپ کے عیسائی معاشرہ کے نظامِ اقدار اور رسم و رواج کے ہی طرف ایک قدم تھے، فرق بس اتنا ہے کہ اسلام ایک نیم وحشی معاشرہ میں نمودار ہوا اور مغرب اعلیٰ ترین انسانی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ ان اثرات سے ہمارے اجتماعی ذہن وشعور کی یہ صلاحیت کمزور ہوگئی کہ ہم خارجی دنیا کا ایک تنقیدی جائزہ لے سکیں، یا تو ہمارے اندر مغربی اثرات اور تحریکات اور رجحانات کو بلا پس وپیش قبول کرنے کی یا بلا سوچے سمجھے ان کی مخالفت کرنے کی یا زبان سے مخالفت اور عملاً قبول کرنے کی مریضانہ اور غلامانہ ذہنیت پیدا ہوگئی۔ اپنے دین کو قائم رکھنے اور ایک اجنبی تہذیب کو قبول کرنے کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ نہ وہ تہذیب اپنائی جاسکتی ہے نہ دین قائم رہتا ہے۔

اب دین کی غیر روحانی اور مادی تعبیریں شروع ہوگئیں۔ دین کی اصل ایک تسلیم و اطاعت کا تجربہ ہے۔ دین کی تمثیل ایسے دی گئی ہے جیسے بیج سے درخت اگتا ہے۔ بجائے عقل کو روشن اور شعور کی تطہیر اور تزکیہ کرنے والے تجربہ کے دین چند نظاموں کے مجموعہ کا نام ہوگیا، اخلاقی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، سماجی نظام وغیرہ۔ یہ سب نظام اپنی جگہ پر لیکن یہ ایسی ہی بات ہے جیسے زندگی کی تعریف یہ کی جائے کہ وہ چند اعضاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ دین جو ایک حقیقت ہے وہ ایک نظریہ بن گیا۔ حقیقت معروضی ہوتی ہے، مطلق ہوتی ہے، کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، حق کے مقابل حق نہیں ہوتا بلکہ باطل ہوتا ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں، نظریہ کسی نقطۂ نظر کے تابع ہوتا ہے، نظریہ موضوعی ہوتا ہے، اضافی ہوتا ہے، نظریہ کے مقابلے میں بھی نظریہ ہوتا ہے۔ نظریہ کا پراپاگنڈہ کیا جاتا ہے۔ حقیقت کی تبلیغ ہوتی ہے، اور پراپاگنڈہ اور تبلیغ میں بہت فرق ہے۔ جیسے سیکولرزم دین میں سرایت کرگیا تو دین کا سیاست میں استعمال ہونا بلکہ استحصال کیا جانا بہت آسان ہوگیا۔ انسانی شعور کے مراتب اور درجات میں دین کا مقام

سیاست سے بہت بلند ہے، دین اپنے مقام سے انسانی شعور کی تربیت اور تہذیب کرکے اور اس میں حق و باطل کا فرق پیدا کرکے دنیاوی زندگی کے ہر شعبۂ اخلاق، معاشیات اور سیاست پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن اس کا مقام اپنا ہے۔ تم دیکھو کہ مسلمانوں کی تاریخ میں علمائے حق اور اہلِ عرفان کا بادشاہوں کی سیاست سے کس قسم کا تعلق رہا ہے، اب دین کو اپنے مقام سے نیچے گھسیٹ کر سیاست کے درجہ میں رکھا گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ دین بجائے اس کے کہ انسانی روح کے لیے ملجا و ماوا ہو اور انسانی زندگی کے لیے ایک سرچشمۂ ہدایت ہو، کارزارِ سیاست میں ایک فریب اور حربہ بن گیا، اور لوگوں کو اس سے بدظنی اور زیادہ گہری ہو گئی۔

جب شعور دین کی گرفت سے آزاد ہوا تو وہ ہر قسم کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ اثر جدید مغربی زندگی کے بنیادی تصورات کا ہونا لازمی تھا۔ انفرادی آزادی جس کے معنی غیر مقید اباحت ہو، معیارِ زندگی جو بجائے کیفیت کے کمیّت کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے، اور "ترقی" کی خالص مادی تعبیر زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد بن گئے۔ اور بجائے اس کے کہ دین کو اس تصورِ حیات کی تنقید کا معیار بنایا جاتا اس تصورِ حیات کو دین کی تنقید کا معیار بنایا گیا، اور وہ لوگ جو نہ موجودہ زمانے کے مسائل اور تقاضوں میں گہری نظر رکھتے ہیں نہ جن کو دین کی روح کا شعور ہے، ایک کھوکھلے اور بلند بانگ سیاسی نعرے کے طور پر یہ بات دہرانے لگے کہ دین کو زمانے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ زمانے کو کس کا ساتھ دینا چاہیئے؟

اِس بگڑے ہوئے تصوّر کی وجہ سے ہمیں بظاہر دَورِ حاضر میں مذہب سے بیگانگی نظر آتی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر دَور کو دین کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغرب کی بیچینی بھی صرف مذہب سے دوری ہی نہیں بلکہ مذہب کی تلاش بھی ہے۔

مِلّت

اِتحّاد اور یک جہتی

انسانی معاشروں میں اتحّاد زندگی کی بنیادی قدروں پر اتفاق اور اجتماعی مقاصد کے لیے اشتراکِ عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں اتحاد کی مابعدالطبیعاتی بنیاد ایک اللہ پر یقین ہے۔ وحدتِ ملّی توحید کا عملی اور سماجی مظہر ہے۔ تمام عالمین کا خالق اور رب ایک ہی ہے۔ تمام خلق اسی کا کنبہ یا عیال ہے۔ انسان کا انسان سے رشتہ بلالحاظ رنگ ونسل یا عقیدہ ومذہب ایک اللہ کے بندے ہونے کی بنیاد پر استوار ہے، اور انسانی کنبہ کے وہ لوگ جو اللہ کی عبادت میں ہمارے رفیق وشریک ہیں، بلا امتیاز رنگ ونسل دین میں ہمارے بھائی ہیں۔ اس اتحّاد واخوّت کی بنیاد یہ ہے کہ ہم ایک ہی آقا کے فرمانبردار غلام، ایک ہی مقصد کے حامل، ایک ہی راہ کے رفیق، ایک ہی جہت کے راہی ہیں۔ یہ اتحاد کسی سیاسی تدبیر سے یا قیمتی منصوبے سے یا وقتی سمجھوتے سے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اللہ کی رسّی کو مضبوط چنگل سے پکڑنے کی ہدایت فرماتا ہے اور ان کو فرقے فرقے ہونے سے منع کرتا ہے۔ گویا اگر وہ ایک ہی راستہ کو اختیار کریں تو اُن میں انتشار پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کو یاد دلاتا ہے کہ مسلمان ہونے سے پہلے عرب آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس کی نعمت سے وہ آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔ حالانکہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ قوم جو فساد اور انتشار کی لعنت میں مبتلا ہے، آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑی ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے اتحاد کی نشانی روشن کردی۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے ارشاد فرماتا ہے کہ تم دنیا کے خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی دلوں میں یہ محبت پیدا نہ ہوتی، یہ تو اللہ تعالیٰ نے دلوں میں محبت پیدا کردی ہے، اور وہ عزیز وحکیم ہے، گویا وہ رشتہ جو اتحّاد اسلامی کی بنیاد ہے کسی لالچ یا خوف سے پیدا نہیں ہوتا۔ لالچ کی وجہ سے تو بھیڑیوں کا ایک گروہ بھی آپس میں ایک ہوجاتا ہے اور خوف کی وجہ سے بھیڑوں

کا گلہ بھی مل بیٹھتا ہے۔ اتحادِ اسلامی کا محرک اس جذبہ اور ارادہ اور عمل میں اشتراک ہے کہ دنیا میں اقامِ صلوٰۃ کر کے اللہ کی حاکمیت اور بندوں کی آزادی اور مساوات کو قائم کیا جائے۔ ایتائے زکوٰۃ کر کے لوگوں میں عدل اور احسان کو پھیلایا جائے، امر بالمعروف کر کے قوم کی برائیوں اور بدحالیوں کو اس کی ذلت اور مسکنت کو دور کیا جائے۔ نہی عن المنکر کر کے فساد اور انتشار کی طاقتوں کا قلع قمع کیا جائے۔

متحد معاشرہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس معاشرہ کے لوگوں میں کوئی اختلافِ رائے نہیں ہے، اتحاد کی بنیادی حدود کے اندر جن کی طرف اشارا کیا گیا ہے اختلافات انتشار کا باعث نہیں ہوتے۔ ان سے تضادات پیدا نہیں ہوتے بلکہ اتحاد زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اللہ کی حاکمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلے میں آزاد ہے۔ کوئی نازک سے نازک صورتِ حالات ایسی تصور نہیں کی جا سکتی جس میں انسان کے ضمیر و اظہار کی آزادی کو سلب کرنے کو جائز قرار دیا جا سکے وہاں یہ ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرے کہ وہ اپنے اختلافات یا احتجاج کا کس طرح اور کس حد تک اظہار کرے تاکہ اس کا احتجاج مؤثر بھی ہو سکے اور اس سے معاشرہ میں فساد بھی پیدا نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زبان پر اصلاح کا دعویٰ ہو اور عملاً وہ فساد پیدا کرنے کا موجب بن جائے۔ اپنے فرض کی پُرخلوص ادائیگی سے خود ایک ایسا حق پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا کی جابر سے جابر حکومت بھی مسترد نہیں کر سکتی۔

متحد معاشرہ کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس معاشرہ کے لوگوں میں کوئی امتیازات نہیں ہیں، انسان جہاں جہاں رہتے ہیں وہاں نسلی اور مقامی اور تاریخی اثرات سے ان کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، طور طریق میں کچھ امتیازات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں قبائل کے ایسے ہی امتیازات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے ایک طرح کا تعارف اور تشخص پیدا ہوتا ہے اور یہ تعارف اور تشخص اگر عصبیت کی شدت اختیار نہ کریں۔ اس وقت تک اتحادِ ملی میں مانع نہیں ہوتے جو نیک مقاصد میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ علاقائی امتیازات اس وقت عصبیت میں ہو جاتے ہیں اور فساد و انتشار

کا باعث ہوتے ہیں جب بلند ملی مقاصد کے لیے اشتراکِ عمل مفقود ہو۔ ورنہ اپنے مناسب حدود میں ان امتیازات کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک گلدستہ میں مختلف رنگ و بُو کے پھول مل کر ایک نئے اور خوشتر رنگ و بو کے نمونہ کی تخلیق کریں۔

حقیقت میں اتحاد اور یک جہتی ایک مشترک مقصد کے لیے مل کر کام کرنے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اتحاد کو ختم کرنے والی ایک وبا یہ ہے کہ لوگ باتیں کرنے والے ہوں کام کرنے والے نہ ہوں۔ باتیں کرنے والے اور کام نہ کرنے والوں کی قرآنِ حکیم میں سخت مذمت آئی ہے۔ صحیح نظریات عمل کے ذریعے ہی پیدا ہوتے ہیں اور عمل کی کسوٹی پر ہی پرکھے جاتے ہیں۔ عمل کے ذریعہ ظن و گمان کی جگہ علم ہوتا ہے۔ صحیح جہت کا تعین ہوتا ہے۔ نظریاتی اختلافات نظریاتی سطح پر طے نہیں ہوا کرتے بلکہ عمل کی سطح پر طے ہوتے ہیں۔ ہر سطح کے اختلافات اس سطح پر طے نہیں ہوتے بلکہ اس سے بلند سطح پر طے ہوتے ہیں۔ افلاس، جہالت، امراض، اور ظلم کو دور کرنے کی باہمی کوشش ہی امر بالمعروف ہے اور اتحاد و یکجہتی کی ضامن ہے۔

جس معاشرے میں ظلم و استحصال ہو وہاں اتحاد و یک جہتی ناممکن ہے، عدل اور احسان کے بغیر اسلامی اتحاد کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اگر معاشرہ عدل کے مرکزِ ثقل سے ہٹا ہوا ہو تو وہاں فساد کا ہونا ناگزیر ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر شئے کو اپنی جگہ پر رکھا جائے، حقوق العباد کو پوری طرح ادا کیا جائے۔ اسلام نے ہر انسانی تعلق کے حدود اور فرائض مقرر کر دیئے ہیں، حدود اللہ کو قائم کر دیا ہے، اعتقادات اور عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات اور اخلاق کے تمام پہلو واضح کر دیئے ہیں۔ روزی کمانے میں جسے فضلِ الٰہی کی تلاش کہا گیا ہے حلال و حرام کا فرق بتا دیا گیا ہے۔ بے سہاروں کی خبر گیری اور مساکین کے پیٹ بھرنے کی تدابیر کرنا ان تمام وسائل کی حد تک جو کسی زمانے میں مہیا اور موجود ہوں فرض قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے فرائض کو پورا کرنا عدل ہے۔ جو عدل نہیں کرتا وہ قرآنی اصطلاح میں ظالم ہے، ظالم اور مظلوم بھائی بھائی نہیں ہوا کرتے۔ اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرے یا کسی کا استحصال کرے اور جس پر ظلم ہو رہا ہے یا جس کا

استحصال ہو رہا ہے اس کو فریاد کرنے یا احتجاج کرنے سے اس عذر پر روکے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، اور اس کی فریاد یا احتجاج سے وحدتِ ملّی پارہ پارہ ہوتی ہے تو یہ ظلم بالائے ظلم ہے، حضورؐ نے ظالم کو ظلم کرنے سے روکنے کی جو تاکید فرمائی ہے، تو اس میں نہ صرف ظالم کی بھلائی ہے بلکہ اتحادِ ملّی کو اپنے صحیح مرکز یعنی عدل پر قائم رکھنے کی مصلحت بھی مضمر ہے۔ انھیں فرائض کو انفرادی و اجتماعی طور پر خوش دلی کے ساتھ پورا کرنا۔ اللہ کے فضل کے ساتھ ساتھ، اللہ کی رضا اور رضوان کی بھی تمنا کرنا احسان ہے بغیر عدل کے احسان نہیں ہے۔ احسان عدل کا وہ بلند مقام ہے جسے اخوت کہتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بھائی کا ذمہ دار ہے۔ اگر پورے معاشرے میں کوئی شخص بھوکا سو جاتا ہے یا کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں پاتا یا وہ مظلوم ہے اور اس کی دادرسی کی کوئی سبیل نہیں۔ تو تمام معاشرہ اس کے لیے جواب دہ ہے اور اس معاشرہ میں اتحاد و اخوت ناپید ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم میں کوئی اختلافات ہوں تو مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے بھائیوں میں صلح کرا دو۔ اللہ کی زمین پر اصلاح کے بعد فساد مت کرو۔ فساد کرنے والوں کو یہ جبر روک دو۔ فساد قتل سے زیادہ شدید ہے۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور گروہ گروہ نہ بن جاؤ جو تمھارے اتحاد کی بنیاد ہے۔ اس کو پارہ پارہ مت کرو، الامر کو منقطع مت کرو، اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر اللہ سے ڈرتے رہو گے اور واقعی اصلاح کی کوشش کرو گے تو اللہ تم پر رحم کرے گا۔ اس بات کو سختی سے منع کیا گیا ہے کہ باہمی اختلافات کی وجہ سے تم ان لوگوں کو جو تمھاری ملّت کے دشمن ہیں۔ اپنا دوست اور مددگار بتانے لگو، اس سودے میں کھلا ہوا نقصان ہے۔ غرض اسلامی اتحاد کی بنیاد توحید ہے۔ اس کا طریق عدل ہے، اور اس کا مقصد فلاحِ دارین ہے۔

ملّت کا استحکام

ملّت کی مکانی جہت اس کا وطن اور جغرافیائی ماحول ہوتا ہے، ملّت کی زمانی جہت مشترکہ تاریخی تجربہ ہوتا ہے۔ ملّت کی روح اس کا مذہب یعنی اس کے عقائد اس کی رسومِ عبادت، اس کے اقدار و مقاصد، اس کے ادارے اس کا قانون ہوتا ہے۔ ان عوامل سے ایک مخصوص طریقِ زندگی، ایک اندازِ فکر ابھرتا ہے۔ اس طریقِ زندگی سے وابستگی اور اس کی وجہ سے افراد میں یگانگت اور وحدت کا احساس اور شعورِ ملّت کی اساس ہے۔

جب تک اس ملّت میں یقین اور اتحاد کی صفات موجود رہتی ہیں اور وہ اپنے روز افزوں علم اور پیہم عمل سے زمانے کے داخلی اور خارجی تقاضوں کا حل پیش کرتی رہتی ہے۔ وہ زندہ رہتی ہے، لیکن جب وہ ملّت علمی مسابقت میں پیچھے رہ جاتی ہے، عمل میں سست ہو جاتی ہے، اس کے قول و فعل میں منافقانہ تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ بدلتے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کا حل پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ حال سے آنکھیں بند کر کے ماضی کے جھوٹے سچے خوابوں میں کھو جاتی ہے، جمود اور غفلت کا شکار اور ظلم اور تفرقوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے اور اس کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے جس کو قرآنِ حکیم نے شرک، ظلم، ذنب، مکر و السیئات اور استکبار فی الارض کی بلیغ اصطلاحوں سے واضح کیا ہے تو پھر اس ملّت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

اس زوال کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں، حوادثِ زمانہ آندھیوں کی طرح یا ایک ہولناک چنگھاڑ کی طرح اِس ملّت کو فنا کر دیتے ہیں، یا کوئی خارجی عذاب اس پر مسلّط ہو جاتا ہے جیسے سر پر چھت گر پڑے یا آسمان کا کوئی ٹکڑا زمین پر آپڑے یا اسی ملّت کے پامال طبقات اس ملّت کو منقلب کر دیتے ہیں گویا پاؤں کے نیچے عذاب ظاہر ہو جائے۔ یا اس ملّت کے منتشر گروہ آپس میں لڑ لڑ کر دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔

خوف اس ملت کو گھیر لیتا ہے اور اس کی چالبازیاں اس کو اور زیادہ فنا کی طرف دھکیلتی ہیں، یہاں تک کہ اسی بے عملی اور بدعملی کی پاداش میں اس ملت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ دفع کر دیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں قوموں کے عروج و زوال کے لرزہ انگیز قانون کو اصول اور مثالوں کے ذریعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور افراد اور ملل کی زندگی اور بقاء اور استحکام کے راستہ کو الصراط المستقیم کی تشریح سے واضح کیا گیا ہے، ملت کا اصل اصول اور صراطِ مستقیم کی بنیادی شرط عقیدۂ توحید ہے، اس عقیدہ کا اجتماعی زندگی میں نفوذ انسانی آزادی اور مساوات اور اتحاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آزادی اس طرح کہ چونکہ ہر انسان خدا کا بندہ ہے اس لیے کوئی انسان کسی انسان کا بندہ نہیں ہے نسل اور دولت اور طاقت کے بتوں کی پرستش کفر اور شرک ہے۔ مساوات اس طرح کہ چونکہ ہر انسان خدا کا بندہ ہے اس لیے مشترک بندگی کی وجہ سے ہر انسان دوسرے انسان سے مساوی درجہ رکھتا ہے۔ نظامِ عالم چلانے کے لیے مختلف انسانوں میں طاقت اور ذمہ داریوں کی تقسیم یا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مختلف انسانوں کے مراتب کی تفریق اس بنیادی انسانی مساوات پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اتحاد اس طرح کہ چونکہ ہر انسان خدا کا بندہ ہے اس لیے ایک آقا کے حکم کی فرمانبرداری اور ایک قانون کی پابندی سے انسانوں میں اتحاد پیدا ہونا لازمی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اتحاد کی بنیاد یہی بتائی گئی ہے۔ اللہ کی رسی کو مل کر مضبوطی سے پکڑنے والوں میں الفت پیدا ہوتی ہے، دنیا جہان کی دولت خرچ کرنے سے یہ بات پیدا نہیں ہوتی، گویا ایک آئین کی پابندی اور ایک قانون کی اطاعت اتحاد کی ضمانت ہے۔ جس قوم میں فرد کی آزادی اور مساوات کا ضامن آئین نہ ہو یا جہاں قانون کا احترام نہ ہو بلکہ جزوی اور شخصی مفادات قدرِ اعلیٰ ہوں وہاں اتحاد کا ہونا ناممکن ہے۔

ملی استحکام کی دوسری شرط قیامِ عدل ہے، تاکہ ظلم اور فساد فی الارض کا سدِّباب ہو، جہاں عدل نہیں ہے وہاں ظلم ہے، جہاں ظلم ہے وہاں فساد ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ظلم سے زیادہ ملعون اور مذموم اور کوئی برائی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ

شرک بھی ظلم ہی کی ایک صورت ہے۔ فقطع دابر القوم الذی یظلموا فالحمد للہ رب العلمین ہ زکوٰۃ اور صدقات عدل کا معاشی پہلو ہیں، تاکہ معاشرہ میں اتنی معاشی ناہمواری نہ ہو کہ ایک ملّت دو ملتوں میں، ایک استحصال کرنے والی اور دوسری استحصال ہونے والی ملّت میں منقسم ہو جائے۔

دنیا کا ہر انقلاب بدلے ہوئے حالات میں عمرانی اور معاشی عدل کی از سرِ نو تعریف کرنے کی کوشش ہے، ہمیں عدل اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ احسان کی بنیاد عدل ہے۔ اور نتیجہ اخوت ہے۔ جس احسان کی بنیاد عدل نہیں ہے وہ احسان نہیں ہے۔ مستحکم اور متمکن ملّت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ قیامِ صلوٰۃ کرتے ہیں، ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور ملّت کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ نیکیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو روکے۔ یہ ہر مؤمن کا دوسرے مؤمن پر حق ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ کو حق ہوگا کہ وہ اپنا عذاب تم پر نازل کرے اور پھر تم دعائیں مانگو گے اور وہ مقبول نہیں ہوں گی۔ اگر کسی قوم میں ظلم کو ظلم کہنے والی اور حق کا اعلان کرنے والی ہمت مفقود ہو جائے تو اس قوم کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایک حق بیں اور حق کوش مردِ خدا ملّت اور عذابِ الٰہی کے مابین دیوار بن جاتا ہے۔

چوتھی شرط استحکامِ ملت کی حصولِ علم ہے۔ علم کی فضیلت اور علم کی ضرورت کے متعلق جو آیاتِ الٰہی نازل اور احادیثِ نبوی وارد ہوئی ہیں ان کو دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے، بس اتنا کہنا کافی ہے کہ دینِ اسلام سرتا سر علم ہے اور حصولِ علم کی ترغیب ہے، یہ دین کان کھولنے والا، آنکھوں کو روشن کرنے والا، قلب کو زندگی بخشنے والا ہے۔ تاریخ ایام اللہ ہے، کائنات میں آیاتِ الٰہی ہیں، انسان کے اندر اور چاروں طرف اللہ کی نشانیاں ہیں، اٹھتے بیٹھتے، تاریخ اور فطرت کا مشاہدہ اور اس پر غور و خوض، اس کے مقصد اور معانی کو سمجھنا، اس کے راز دریافت کرنا مومن کا فرضِ عین ہے، علم خلافت

فی الارض کی سند ہے، تسخیرِ کائنات کی کنجی ہے، بغیر علم کے انسان انسان نہیں۔ جانوروں سے بدتر ہے، محاسبانِ قدرت جب کسی ملّت کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں یہ شق بہت اہم ہے کہ اس ملّت کے نوجوان کس انہماک اور مستعدی کے ساتھ حصولِ علم کے فریضہ میں مشغول ہیں۔

علم کے ساتھ ساتھ عمل ہے اور عمل کی دو صورتیں ہیں۔ تقویٰ اور جہاد۔ اپنے نفس اور خواہشات کی پیروی نہ کرنا، بلکہ ایسے کام کرنا جس میں نیکی ہو اور خلق اللہ کی بھلائی ہو تقویٰ ہے۔ اگر کسی قوم میں ایسے افراد بکثرت ہوں جو بڑے سے بڑے اجتماعی اور ملّی مفاد کو اپنی ذاتی غرض پر سے قربان کرنے پر تیار ہوں تو اس قوم میں تقویٰ کا فقدان ہے۔ وہ قوم قرآنی اصطلاح میں فاسق ہے۔ جہاد محض قتال کو نہیں کہتے۔ جہاد ہمارا فلسفۂ حیات ہے۔ قرآنِ حکیم میں سب سے زیادہ آیتیں بلاواسطہ یا بالواسطہ جہاد سے متعلق ہیں۔ جہاد کی پہلی شق اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو اس مقصد کے لئے بروئے کار لانا ہے۔ ۔ ۔ ۔ کہ ہماری ملّت میں خدا کی عبادت ہو، آدمی کا احترام ہو، عدل کا بول بالا ہو، احسان اور اخوّت کی فضا ہو، ہر شخص اپنے بھائی کا ولی اور مددگار ہو۔ نیکیاں پھولتی پھلتی ہوں اور برائیاں خود بخود مرجھا جاتی ہوں، علم کی روشنی روز بروز پھیلتی جارہی ہو، ہر انسان کو اپنی دماغی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لامتناہی مواقع موجود ہوں۔ اور دوسری شق یہ ہے کہ ایسی ملّت کو قائم رکھنے کے لیے فرد اپنی جان اور مال کی آخری قربانی دینے کی صلاحیت رکھے۔ جتنا مقصد بلند ہوتا ہے اتنی ہی قربانی آسان ہو جاتی ہے کیونکہ فرد اور ملّت میں ایسا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ملّت کے باہر فرد کو اپنی زندگی ہی بے معنی نظر آتی ہے۔ جہاد ایک پیشہ نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے جو ہر فرد پر فرض ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم اپنے دفاع کی حسبِ استطاعت تیاری کریں اور جب نیت صادق ہے تو اللہ تعالیٰ استطاعت کے دامن کو بہت وسیع کر دیتا ہے۔ یہ بات ہتھیاروں کی فراہمی کی دوڑ میں حصّہ لینے سے بہت مختلف ہے کیونکہ اس میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں ہے بلکہ یہ خوف سے امن کی طرف راستہ ہے۔ بہت سی ملتیں

دولت کی فراوانی کے باوجود فنا ہوگئیں۔ بہت سی قومیں اپنی فوجی برتری اور ہتھیاروں کی فراہمی کے باوجود مٹ گئیں۔ لیکن اگر ملت میں جہاد کی روح موجود ہے تو اسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت مٹا نہیں سکتی، اس کی بقا کا ضامن خدا ہے۔

تعمیر و ترقی

کسی ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ انسان ہیں، اگر کسی قوم کی حالت کا اندازہ کرنا چاہو تو یہ دیکھو کہ اس کے افراد کا اخلاق کیسا ہے، ان کے ارادے اور آدرش، ان کی ہمت اور خود اعتمادی، ان کی زندگی کی قدریں کیا ہیں، ان میں علم و عمل کی تڑپ، ان کے آپس کے تعلقات کیسے ہیں، یہی قوم کی دولت اور طاقت ہے، اگر کسی قوم میں یہ سرمایہ موجود ہے تو وہ غریب نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر دولت اور طاقت پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے، اور اگر کسی قوم کا یہ سرمایہ کم ہو گیا تو وہ قوم دولت کی فراوانی اور طاقت .. .. .. کی موجودگی میں ختم ہو جاتی ہے، اس کی دولت تعیش اور بے عملی پیدا کرتی ہے اور اسکی طاقت آپس کے لڑائی جھگڑوں میں ضائع ہو جاتی ہے اور پھر اس پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی جاتی ہے، قرآن حکیم میں کسی قوم کے زوال کی یہی دو نشانیاں بتائی گئی ہیں، مسکنت افلاس اور محتاجی ہے، ذلت کمزوری اور غلامی ہے، یہ گویا زوال کی معاشی اور سیاسی دو جہتیں ہیں۔ ہماری قوم اس تلخ تاریخی تجربہ سے گذر چکی ہے، جس وقت ہمارا زوال شروع ہوا تھا اس وقت ہمارے پاس دولت بھی تھی اور طاقت بھی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہماری قوم اس گھاٹی سے نکل کر ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں ہم اس زوال کے اثرات کو ختم کر سکتے ہیں، اور ترقی کی نئی راہیں دریافت کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری آزمائش ہے۔

انسان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو جو اللہ نے ودیعت کی ہیں ان کو اس حد تک ترقی دے جس حد تک ان کی ترقی ممکن ہے، اور ان کو مناسب مصرف میں استعمال کرے۔ بیشک یہ صلاحیتیں اور توانائیاں مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، بہت سے لوگ عظیم صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں ان کا حساب ان کے مرتبے کے مطابق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تم سے یہ سوال

نہیں کرے گا کہ تم ویسے کیوں نہیں ہوئے جیسے وہ لوگ تھے، لیکن ہم اس کے لیے ضرور جواب دہ ہیں کہ ہم ایسے کیوں نہیں ہوئے جیسے کہ ہم ہو سکتے ہیں۔ ہم بالفعل ایسے کیوں نہیں ہوئے جیسا بالقوّہ اس نے بنایا تھا اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو دریافت اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ان کو مہیا مواقع میں بروئے کار لایا جائے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو دیکھو گے کہ نہ صرف یہ کہ جو مواقع تمھیں مہیا ہیں، ان میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ترقی دینے کی بڑی گنجائش ہے، بلکہ تم میں نئے مواقع پیدا کرنے کی بھی بڑی صلاحیت اور توانائی ہے۔ اور ان کو مناسب مصرف میں استعمال کرنا یہ ہے کہ ان سے خلقِ خدا کی خدمت کی جائے، ایک فرد اپنے ماحول سے بہت کچھ لیتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت، اس کی شخصیت کی تعمیر اور ترقی میں ماحول کا بھی ایک اہم حصّہ ہوتا ہے، تو اس کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی جہاں تک ہو سکے خلقِ خدا کی خدمت کر کے اپنے ماحول کو بہتر بنائے۔ جتنی خدمت کرے گا تو اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا سرمایہ بڑھے گا۔ جس طرح نیک راہ میں خرچ کی ہوئی دولت میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں بھی بے جان اور بے فیض ہوتی جائیں گی جس طرح سود سے کمائے ہوئے روپے سے اللہ تعالیٰ برکت زائل کر دیتا ہے۔ یہ حساب رکھنا بہت ضروری ہے کہ تم نے دنیا سے کیا لیا، اور تم نے دنیا کو کیا دیا، اسی حساب پر خدا اور انسانیت کے سامنے ایک فرد کی ساکھ کا انحصار ہے، کُلاً وہ قوم کس طرح ترقی کر سکتی ہے جس کے افراد اس قوم ہی کے دیئے ہوئے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے چھوٹے سے چھوٹے منافع کے لیے قوم کے بڑے سے بڑے نقصان کی پرواہ نہ کریں، لیکن یہ کھیل کتنے دن تک کھیلا جا سکتا ہے؟ آخر کبھی نہ کبھی قرضے کا حساب بھی دینا پڑتا ہے اور لُوٹ کھسوٹ کا جواب بھی دینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس دنیا میں پیدا کیا ہے اور اس دنیا میں تمام معیشت کے سامان رکھے ہیں۔ اس زمین اور آسمان میں اور پہاڑ اور سمندر میں اور ہوا میں اور روشنی میں تمھارے لیے دولت کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں عقل دی ہے اور عقل دے کر یہ بشارت دی ہے کہ زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ

ہے وہ تمھارے لیے مسخّر کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں قویٰ دیئے ہیں اور یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تمھارے لیے اتنا ہی ہے جتنی تم سعی کرتے ہو۔ ایک طرف تو وہ خزانے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں رکھ دیئے ہیں اور دوسری طرف تمھارے عقلی اور جسمانی قویٰ کی سعی و محنت ہے جس میں اس نے ان خزانوں سے تمتع حاصل کرنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ بس ہر پیداوار کے یہی دو عامل ہیں۔ سرمایہ بھی آپ کا ہو یا غیر کا ہو فطرت کے خزانوں پر سعی و عمل ہی کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا مقصد بھی یہ ہے کہ قدرت کے خزانوں پر محنت کا عمل زیادہ مؤثر ہو جائے، جو ترقی یافتہ قومیں کسی نقصان یا تباہی کی زد میں آ گئی تھیں انھوں نے قرض یا امداد سے اپنی تباہی اور نقصان کا تدارک تو کر لیا لیکن کوئی پسماندہ قوم ترقی یافتہ نہیں بن سکتی۔ بیس سال سے زیادہ دنیا کے تجربہ کا یہی نچوڑ ہے۔ علم کے لیے کہا گیا ہے کہ جہاں پاؤ اس کو لے لو۔ علم ہی سے عقل کو جلا ہوتی ہے اور عمل کی نئی نئی راہیں سوجھتی ہیں۔ محنت کے لیے کہا گیا ہے کہ بغیر محنت کے تم کچھ نہیں بن سکتے، لیکن دولت کے لیے یہ نہیں کہا گیا کہ جہاں دیکھو اس کو لوٹ لو یا اُس کے سامنے بھیک کے ہاتھ پھیلا دو۔ پہلا جرم ترقی یافتہ قوموں کا ہے، دوسرا جرم پسماندہ قوموں کا ہے، وہ قرض یا امداد جو کسی فرد یا قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے میں صرف نہ ہو بلکہ اس کو کمزور کر دے اسلام کی نگاہ میں مردود ہے۔ خود اعتمادی کے زائل ہونے سے بڑا اور کوئی نقصان ممکن نہیں کیونکہ اس سے تو فرد یا قوم کی شخصیت کی جڑیں ہی کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ خود اعتمادی خدا پر اعتماد کا لازمی نتیجہ ہے اور خدا پر اعتماد ایمان کا بنیادی اور عملی جزو ہے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ فرد اور قوم بڑے گہرے رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ قوم کو فرد بناتے ہیں اور قوم افراد کو بناتی ہے۔ یہ ایک حقیقت کے دو پہلو ہیں جن کو متوازن طور پر اپنی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ افراد کی سعی سے یعنی ان کے علم و عمل سے قوم ترقی کرتی ہے، اور قوم جتنا ترقی کرتی ہے اتنے ہی ایک فرد کو ترقی کرنے کے لیے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح بلندی کی طرف چلتا رہتا ہے۔ اور افراد

علم اور عمل میں جتنے سست ہوتے ہیں اتنی ہی قوم پسماندہ ہوتی ہے اور قوم جتنی پسماندہ ہوتی ہے اتنے ہی ایک فرد کے لیے ترقی کے راستے تنگ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس دنیا میں جہاں قوموں میں مسابقت اور بقا کی دوڑ تیز ہو چکی ہے وہ قوم اپنا مقام کھو دیتی ہے۔ جو قومیں پسماندہ حالت سے ترقی کر کے آج قوموں کی صفِ اوّل میں آگئی ہیں ان کی تاریخ کو اگر دیکھو تو تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انھوں نے یہ مقام اکثر بڑی مخالفتوں کے باوجود اپنی خود اعتمادی اور محنت سے حاصل کیا ہے اور دوسری یہ حقیقت تمھارے سامنے آئے گی کہ ایک قوم کو پسماندگی کے غار سے نکالنے کے لیے کم از کم ایک نسل کو اپنی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ایک پسماندہ قوم کی پیش رو نسل اپنے آگے آنے والی کئی نسلوں کو گرو رکھ کر ہی بلکہ اپنے تمام مستقبل کو داؤں پر لگا کر ہی عیش کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ترقی یافتہ قوموں کا امتحان عیش کے ذریعے لیتا ہے۔ پسماندہ قوموں کے لیے تو اُن کا افلاس ہی بہت بڑا امتحان ہے۔

ہم اب تک ترقی کی مادّی جہت کی گفتگو کر رہے تھے۔ ایک دوسری اور اہم جہت اس کی اخلاقی اور انسانی جہت ہے۔ ہر تغیر اور اصلاح کا خواہ وہ سیاسی نوعیت کی ہو یا اقتصادی نوعیت کی ہو، اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اور یہی اس اصلاح یا تغیر کی قدر کا آخری معیار ہے، اور یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنی ہے کہ اس انسانی یا اخلاقی جہت کو نظر انداز کر کے کوئی مادی ترقی یا سیاسی اور اقتصادی اصلاح اچھے نتائج کی حامل نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کی دولت بڑھ رہی ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ملک سے افلاس ختم ہو رہا ہے یا نہیں۔ اور افلاس ایک اضافی حالت ہے، یعنی دیکھنا یہ ہے کہ دولت کی تقسیم سے معاشرے کے مختلف طبقات میں فرق کم ہو رہا ہے یا زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ بات طے کرنا ذرا مشکل ہے کہ ملک کی دولت میں ایک فرد کا عادلانہ حصّہ کیا ہے لیکن ایک معیار بڑے وثوق سے متعین کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ عادلانہ تقسیم دولت میں کسی کے پاس وافر دولت کے جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جنابِ امیرؓ نے فرمایا کہ میں نے کسی کے پاس وافر دولت نہیں دیکھی مگر یہ کہ اس میں بہت

سے حقوق تلف کیے گئے ہوں، مومنوں کی تعریف کلام پاک میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ فضول خرچی نہیں کرتے لیکن اللہ کی دی ہوئی دولت میں سے تمام حقداروں کے حق نکالتے ہیں اور بقدرِ کفایت دولت اپنے پاس رکھ کر اس کو صحیح مصارف میں خرچ کرتے ہیں، دولت جمع کرنے والوں کو سخت عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔ گویا ینفقون اور یکنزون کا فرق ایمان کا معیار ہے، دولت کی معاشرہ میں گردش معاشرہ کی صحت کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی خون کی گردش انسانی جسم کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ گمراہ کن اور کوئی بات نہیں کہی گئی کہ چند ہاتھوں میں سرمایہ جمع ہونے سے ملک کی دولت میں ترقی ہوگی چنانچہ علم اور محنت اور خود اعتمادی کے ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی ہی کے لیے نہیں بلکہ فرد کی اخلاقی ترقی کے لیے بھی یہ بات اشد ضروری ہے کہ معاشرہ کے مختلف طبقات میں دولت کی تقسیم کم از کم ظلم کی حد تک غیر منصفانہ نہ ہو ورنہ معاشرہ میں آقا اور غلام کی ذہنیت پیدا ہو جائے گی اور یہ صورت حال بہت سے معنی میں معاشرہ کے لیے بالکل تباہ کن ہے۔

ایک اور بہت ضروری بات یہ ہے کہ لوگوں میں ایک مقصد کے لیے رفاقت کا جذبہ اور شرکائے کار کا رشتہ موجود ہو۔ تم کسی ملک کی یا ملک کے کسی پس ماندہ حصہ کی ترقی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک جن لوگوں کی ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے ان میں یہ احساس حقیقت نہ بن جائے کہ ملک ان کا ہے، گھر اُن کا ہے، اور اس کی بہتری اور بہبود کے لیے ان کو سب سے مل کر اور سب کے تعاون سے خود جد و جہد کرنی ہے۔ یہ مسئلہ صرف اقتصادی یا انتظامی نوعیت ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کا سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی ہے۔ یہ اخوت کا تقاضہ ہے جس کا اظہار نہ صرف تقسیم دولت میں ہونا ضروری ہے بلکہ تقسیم اقتدار میں ہونا بھی لازمی ہے۔

خود اعتمادی کے ساتھ سعی و عمل، عدل اور اخوت ایک معاشرہ کی تعمیر اور ترقی کے لیے یہ چار ستون ہیں، خاتمہ کے طور پر ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ ان خطوط پر قوم کی تعمیر و ترقی سے ملک کے دفاع کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ جب فرد اور

جماعت میں یگانگت کا یہ رشتہ پیدا ہو گیا تو اوّل تو اُس کے پاس دفاع کا سامان بھی مہیا ہو جائے گا اور دوسرے اگر حملہ آور کے مقابلہ میں دفاعی وسائل کی کمی بھی ہے تو قرآنِ حکیم کے وعدے کے مطابق جتنی اس قوم میں استطاعت ہے اللہ تعالیٰ اسے کافی کر دیتا ہے اور اس استطاعت میں بھی مزید وسعت دے دیتا ہے۔ یہی جہاد کی روح ہے اور اس کے مطابق معاشرہ میں دو گروہ ایسے نہیں ہوتے کہ جن میں ایک گروہ اس لئے ہے کہ اس کی محافظت کی جائے، اور دوسرا گروہ ایسا ہے جس کا پیشہ محافظت کرنا ہے۔ بلکہ ہر شخص محافظ ہے اپنی قوم کا اور اس طریقِ حیات کا جس کا وہ قوم متجربہ کر رہی ہے۔

*

دولت کا ارتکاز

ہر معاشرہ کا ایک نصب العین ہوتا ہے، وہی اس کی قدرِ اعلیٰ ہوتی ہے اور اس معاشرہ کی تمام علمی و عملی جد و جہد اسی قدرِ اعلیٰ کی تابع ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ کے واضح مقصد یہ ہیں کہ نسل اور طاقت اور دولت کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے اللہ کی عبادت کو قائم کیا جائے تاکہ صحیح معنی میں انسانی آزادی اور عالمگیر برادری ممکن ہو سکے۔ ادائے زکوٰۃ کے ذریعہ معاشرہ میں عدل جاری و ساری ہو اور ایک ایسی فضا تیار کی جائے جس میں انسانی فلاح و بہبود کی تمام اچھائیوں کو پنپنے کی ترغیب پیدا ہو اور ذلت و مسکنت کی تمام برائیاں دبی رہیں اور اسی مقصد کے حصول اور ترقی کے لیے زندہ رہنا اور مرنا بامعنی ہے اور یہی دنیا و آخرت میں کامیابی ہے۔ اسی مقصد کے تحت زندگی کا معیار اور شرافت کی دلیل دولت و طاقت کی بجائے تقویٰ قرار پایا اور اسی مقصد کا حصول اور ترقی ہمارے تمام مادّی وسائل کا واحد جواز اور مصرف ثابت ہوا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اگر تمھارے آبا اور بیٹے اور بیویاں اور عزیز و رشتہ دار اور جمع کیے ہوئے مال اور تجارت جس میں خسارہ کا اندیشہ ہو، اور تمھارے وہ عالیشان گھر جن سے تم خوش ہوتے ہو تمھیں زیادہ عزیز ہیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور جہاد فی سبیل اللہ سے تو تم انتظار کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا گویا اگر حُبِّ دنیا اور حُبِّ زر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے زندگی کے راستے اور اس راستہ میں جد و جہد سے زیادہ عزیز ہیں۔ تو یہ فسق ہے اور گمراہی ہے، ایک جگہ اور فرمایا کہ عورتوں کی خواہش اور اولاد کی خواہش سونے، چاندی، گھوڑے، چوپایوں کی محبت متاعِ حیاتِ دنیا ہیں مقصدِ حیات نہیں ہیں۔

اور متاعِ حیات کا مصرف محض یہی ہے کہ اس سے مقصدِ حیات حاصل کیا جائے۔ اسلیے قرآنِ حکیم میں ایک طرف بخل کی مذمت کی گئی ہے، دوسری طرف اسراف و تبذیر کی مذمت کی گئی ہے اور انفاق فی سبیل اللہ یعنی نیکی کے راستہ میں مال خرچ کرنے کو خیر و ایمان اور لازمۂ تقویٰ بتایا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کو قرض دینا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑھا چڑھا کر اس کا بدلہ دیتا ہے۔ شیطان کبھی مفلسی کا خوف دلا کر انفاقِ مال سے باندھ رکھتا ہے اور تم سے بخل کرواتا ہے، اور مال جمع کرنے کے لیے بے ایمانی کی تدبیریں سمجھاتا ہے۔ اور کبھی اپنے عیش و عشرت پر اسراف و تبذیر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ لوگ گمراہ اور کافر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ کہ ہم اپنی روزی میں سے کسی کو کیوں دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو بھی روزی دیدیتا۔ یہ قارون کا قول ہے کہ میں نے اپنے علم سے دولت کمائی ہے تو اس کا کیوں کوئی حساب ہو اور کیوں احتساب ہو۔ ایمان والے اپنی دولت میں سائل اور محروم کا متعینہ حق سمجھتے ہیں۔ گویا وہ ان کی مدد کر کے ان پر احسان نہیں دھرتے بلکہ اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔ دولت کے ذریعہ اہلِ قرابت کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، رشتہ داروں، دوستوں، پڑوسیوں، ہم وطنوں، لونڈی، غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے، خرچ کرنے کی حد یہ بتائی گئی ہے کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ مال کو جمع کرنا اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرنا اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایک زوال آمادہ معاشرہ کی جو اللہ کے عذاب کا مستحق ہو گیا ہے، یہ نشانیاں بتائی گئی ہیں کہ وہاں یتیم کا اکرام نہیں ہوتا، گویا اگر کسی کا کوئی سفارشی نہ ہو تو اس کو کوئی نہیں پوچھتا، اور لوگ اس بات کی کوئی تدبیر نہیں کرتے کہ مسکینوں کا پیٹ بھرے اور زمین کی پیداوار اور خزانوں کو جس کا وارثِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے خوب لوٹتے ہیں اور دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر دولت سمیٹتے ہیں۔ ایسا معاشرہ عذابِ الٰہی سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی گھات میں ہوتا ہے۔

اس لیے دینِ اسلام کے تمام آئین و قوانین ایسے ہیں کہ جس سے دولت ایک جگہ جمع ہی نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے قانونِ وراثت ہی کو لے لیجیے کیا اس کا واضح مقصد یہ نہیں ہے کہ بڑی بڑی جائیدادیں اور جاگیریں پیدا ہی نہ ہوں؟ کیا یہ بات کہہ کر کہ انسان کا حق اسی پر ہے جو اس نے اپنی کوشش سے حاصل کیا ہے ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ دولت یا طاقت کے ذریعہ دوسروں کی محنت کا استحصال کرنا اور ان کو ان کا جائز حصّہ نہ دینا غلط ہے۔ سود کو حرام کرنے کا اور اس ارشاد کا کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات میں برکت دیتا ہے یہی مقصد نہیں ہے کہ ارتکازِ زر اور اکتنازِ مال نہ ہونے پائے، اور زکوٰۃ تو جیسا سب کو معلوم ہے دینِ اسلام کا ایک رکن ہے، اس قانون کے تحت تو ارتکازِ زر اور اکتنازِ مال ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کہیں یہ صورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ جنابِ امیرؑ فرماتے ہیں کہ میں نے کہیں یہ نہیں دیکھا کہ کسی شخص کے پاس وافر دولت ہو، اور اس میں کچھ لوگوں کے حق تلف نہ کیے گئے ہوں۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں اکتنازِ مال کے لیے عقوبت و عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو چاندی سونے کے ڈھیر جمع کرتے ہیں۔ اور انفاق فی سبیل اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ انھیں المناک سزا کی خبر دے دو۔ اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا "یہ وہ مال ہے جسے تم نے جمع کر رکھا تھا تو آج اس کا مزہ چکھو"۔ غرض یہ کہ زمین کا یا مال کا چند ہاتھوں میں جمع ہو جانا معاشرہ میں ناہمواری پیدا کرتا ہے، اور اسلامی اصطلاح میں یہ ایک ظلم اور فساد کی صورت ہے۔ ہمیں تنبیہ کی گئی ہے کہ کہیں مال چند مالدار لوگوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔ زر کی حیثیت معاشرہ میں ایسی ہی ہے جیسے جسم میں خون۔ جب خون تمام جسم میں گردش کرتا رہتا ہے تو انسان صحت مند رہتا ہے۔ مگر یہ خون کسی ایک جگہ جمع ہو جائے اور باقی اعضاء تک نہ پہنچے تو جہاں یہ خون جمع ہوا ہے وہاں بھی اور جہاں تک یہ خون نہیں پہونچا وہاں بھی غرض تمام جسم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

ہر وہ اصلاح جس کا مقصد یہ ہو کہ زمین یا زر بجائے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے فائدے کے لیے صرف ہوں، مبارک ہے اور ایک متوازن اور صحت مند معاشرہ کی تعمیر کی طرف احسن اقدام ہے۔

معاشرتی ترقی

ترقی کا قرآنی معیار اور پیمانہ مادّی اشیا کی بہتات اور کثرت نہیں ہے بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کیفیت ہے، جس حد تک مادّی اشیا معاشرہ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دیتی ہیں وہ خیر ہیں۔ جب مادّی اشیاء اخلاقی اور روحانی قدروں کے فروغ میں ایک رکاوٹ بن جاتی ہیں وہ شر ہیں۔ کسی معاشرہ کی ترقی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ اس کے بنکوں میں کتنی دولت جمع ہے، یا لوگوں کے رہنے کی عمارتیں کتنی شاندار ہیں، یا اس نے کتنے لاؤ لشکر جمع کیے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ لوگ اس معاشرے میں کیسی زندگی بسر کرتے ہیں، دولت کس طرح خرچ ہوتی ہے، اس معاشرے میں بے سہارا لوگوں کی عزت یا اکرام ہے یا نہیں۔ مساکین کے پیٹ بھرنے کا کوئی انتظام ہے یا نہیں، ایسا تو نہیں کہ حرص کے اندھے اور مال کے پجاری تمام زمین کی دولت کو جس کا وارثِ حقیقی خدا ہے، بے دریغ لوٹ رہے ہوں، اس معاشرہ کی طاقت لوگوں کو غلام بنانے کے لیے اور ظالموں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے صرف ہوتی ہے یا لوگوں کی آزادی کی ضمانت اور معاشرتی عدل کے قیام کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مادّی اشیاء متاعِ حیات ہیں، مقصدِ حیات پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہیں خود مقصدِ حیات نہیں ہیں۔

ہر سماجی مسئلہ خواہ وہ سیاسی نوعیت کا ہو یا اقتصادی نوعیت کا ہو ایک انسانی مسئلہ ہے، خواہ اس کی صورت سیاسی ہو یا معاشی ہو، مادّی ہو یا روحانی ہو، اس انسانی پہلو کو نظر انداز کر کے سیاسی طور پر طاقت یا دولت کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھنا اور انسان کی حیثیت کو محض اعداد و شمار میں تبدیل کر دینا کفر کا طریقہ ہے اسلام کا نہیں۔

قرآنِ حکیم میں بنی اسرائیل کا ذکر کر کے قوموں کے عروج و زوال، ان کی ترقی و تنزل کا نقشہ اور تجزیہ انسانوں کی ہدایت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ ان پر نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے دو خصوصیتوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ملک اور حکمت۔ اس قوم میں بڑے

بادشاہ پیدا ہوئے اور انبیاء پیدا ہوئے۔ زمین پر تمکن کے لیے جسم یعنی مادی وسائل اور علم یعنی ان وسائل کا صحیح استعمال دونوں ضروری شرطیں ہیں۔ پھر قانونِ الٰہی سے بغاوت کی وجہ سے اس قوم پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی۔ انسانی معاشرہ کی بدحالی ظاہر کرنے لیے ذلت اور مسکنت دو بلیغ اصطلاحیں ہیں۔ ذلت بدحالی کا سیاسی اور مسکنت بدحالی کا معاشی پہلو ہے۔ ذلت خوف کی حالت ہے۔ اور مسکنت جوع (بھوک) کی حالت ہے۔ قومیں اپنی بقاء کے لیے ان ہی دو لعنتوں سے نجات حاصل کرنے کی سعیِ پیہم میں مصروف رہتی ہیں۔ دوسری قوموں سے جو انھیں جو خوف لاحق ہے اس کو دور کرنے کے لیے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں اور اپنی جوع کو مٹانے کے لیے یعنی اپنی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے اور نام نہاد معیارِ زندگی بلند کرنے کیلئے شب و روز محنت کرتی رہتی ہیں لیکن تاریخی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ فوجی طاقت کو بڑھانے سے خوف دور نہیں ہوتا اس لیے کہ حریف طاقتیں بھی اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف رہتی ہیں اور طاقت میں مسابقت اور برتری کی لامتناہی دوڑ جاری رہتی ہے، اور زندگی کی آسائش بڑھانے کی تمنا انسان کو اور زیادہ ان پر حریص اور ان کا محتاج بنا دیتی ہے، اور اس کا نتیجہ بالآخر ظلم اور فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کلامِ پاک میں خوف سے امن کا راستہ اور جوع سے سیری کا راستہ ربِّ کعبہ کی عبادت کو بتایا گیا ہے اور تمام کلامِ پاک ربِّ کعبہ کی عبادت ہی کی توضیح و تشریح ہے۔

اس تعلیم کا سنگِ بنیاد عقیدۂ توحید ہے، عقیدۂ توحید ہر غلامی سے، آمروں کی، سرمایہ داروں کی، امراء کی، برہمنوں کی غلامی سے اللہ کے بندوں کو نجات دلاتا ہے، اور عالمگیر انسانی برادری کی حقیقت کو استوار کرتا ہے۔ یہی عقیدہ معاشرہ میں آزادی اور اتحاد اور مساوات کو ممکن اور بامعنی بناتا ہے۔ توحید کا لازمی نتیجہ مخلوق کا آپس میں عدل کا رشتہ ہے۔ جس جگہ عدل نہیں وہاں ظلم ہے اور ظلم و فساد توأم ہیں۔ دنیا کا ہر انقلاب بدلے ہوئے حالات میں عدل کی تعریف وضع کرنے کی کوشش ہے۔ عدل کا بلند درجہ احسان اور اخوت ہے۔

توحید و عدل پر قائم شدہ معاشرہ کے ہر فرد پر حصولِ علم میں جد و جہد کرنا فرض ہے۔ دین سراسر علم ہے، حکمت خیرِ کثیر ہے، حضورؐ کی بنیادی حیثیت ایک معلّم کی ہے جو آیاتِ الٰہی

کی تلاوت کرتے تھے، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کرتے تھے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تھے، قرآنِ حکیم میں آیاتِ الٰہی ہیں جس میں زندگی کی ہر منزل کے لیے ہدایت ہے اور کائنات کے تمام مظاہر اور طاقتوں کو بھی آیاتِ الٰہی کہا گیا ہے۔ صاحبانِ عقل اٹھتے بیٹھتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آیاتِ الٰہی میں غور کرنے کے دائرہ میں صرف علوم کا حصول ہی نہیں بلکہ ان کی طرف صحیح رویّہ اور ان کا مصرف بھی شامل ہے۔

اللہ کی دی ہوئی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے ذریعہ اللہ کی کائنات سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا اور ان کو انسان کی فلاح وبہبود پر صرف کرنا اللہ کے فضل کی تلاش ہے۔ کائنات کے خزانوں پر ڈاکہ ڈالنا اور قارون کی طرح یہ کہنا کہ میری دولت میرے علم کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے اور اس لیے میں جس طرح اس کو خرچ کرنا چاہوں میں اس کا مجاز ہوں زیادتی ہے، اور ہر طرح کی زیادتی سے بچنا تقویٰ ہے۔ تقویٰ عمل ہے اور علم اور عمل کا ساتھ ہے، علم اور محنت سے حاصل کی ہوئی اس دولت کی گردش میں کسی جگہ کا ارتکاز نہیں ہونا چاہیے جو معاشرہ کے لیے اتنا ہی مُضر ہے جتنا انسانی جسم میں خون کا کسی ایک جگہ جمع ہو جانا۔ انفاق دولت میں زکوٰۃ بھی ہے صدقات بھی ہیں، سائل اور محروم کا بھی حصّہ ہے۔ اصول یہ ہے کہ ایک فرد کی ضرورت سے جو کچھ بھی بچے وہ اللہ کی راہ میں یعنی اجتماعی فلاح وبہبود میں صرف کر دیا جائے، گویا معاشرہ کی ترقی اس میں ہے کہ افراد سادہ سے سادہ زندگی بسر کریں اور ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی پوری ہونے کا انتظام ہو، اور اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے وسائل میں کمی نہ آنے پائے۔ معاشی ناہمواریوں کو دور کرنا معاشرہ کی ترقی کی اوّلین شرط ہے۔ اس شرط کے پورا ہونے سے افراد کی تخلیقی صلاحیتیں آزاد ہو کر اجتماعی ترقی پر مرکوز ہوتی ہیں۔ معاشرے میں شعور اور ضمیر کو بیدار رکھنے کے لیے ہر لمحہ تنقید واحتساب کی ضرورت ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد دوسرے کا نگہبان ہے۔ نیکیوں کی تلقین کرنا اور برائیوں سے روکنا ہر مومن کا دوسرے پر حق ہے۔ اس فریضہ سے غفلت معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہے۔

یہ معاشرہ جس میں اتحاد ہے، جس میں الٰہی قانون کی پابندی لوگوں کی آزادی کی ضامن ہے جس میں عدل واحسان واخوت کی صفات ہیں۔ جس میں دوسری قوموں سے امید وبیم کے تعلق نہیں ہیں بلکہ اپنے خدا پر توکل ہے۔ جس میں علم کے لیے احترام اور اس کے حصول کے لیے تڑپ ہے۔ جس کا عمل تقویٰ ہے، جس میں ہر شخص محنت کو فضلِ الٰہی کی تلاش سمجھتا ہے، جس میں فرد کی ضروریات قلیل سے قلیل ہیں، اور ان کا پورا ہونے کا انتظام ہے، اور اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے وافر وسائل موجود ہیں جس کا شعور اور ضمیر بیدار ہے، ہر فرد کی اوّل وآخر وفاداری کا مستحق ہے۔ اِس معاشرہ سے علیحدہ فرد کی زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ اس معاشرہ کے لیے جینا زندگی کا مقصد، اس کے لیے مرنا زندگی کی تکمیل اور اس کا استقلال زندگی کا حاصل ہے۔ معاشرہ کا دفاع یہی جذبہ ہے۔ اس معاشرہ کے دفاع کے لیے حسبِ استطاعت تمام وسائل مہیّا ہوتے ہیں، اور ہر فرد تیار رہتا ہے۔ اس معاشرہ کا دفاع پیشہ نہیں بلکہ عبادت ہے جو ہر فرد پر فرضِ کفایہ ہے۔ یہ اس معاشرہ کی جلالی شان ہے۔

اس معاشرہ کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے، یہ پھیلنے والا معاشرہ ہے۔ راہِ اعتدال پر چلنے والا، جمالی اور جلالی شان رکھنے والا یہ معاشرہ تمام دنیا میں حق وانصاف قائم کرنے کا ذمہ دار ہے، اس کا وجود تمام عالمِ انسانیت کے لیے ایک معنی اور اہمیت رکھتا ہے۔ اکثر قومیں اپنی طاقت اور دولت کی بہتات میں فنا ہو جاتی ہیں۔ سوائے اس قوم کے جس کے پاس عالمِ انسانیت کے لیے زندگی کا پیغام ہو۔ بیشک دنیا میں وہی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن میں انسانیت کے لیے منفعت ہو۔

دفاعی طاقت

انسانی برادری قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کو بدقسمتی کہہ لیجئے یا انسانی فطرت کی کمزوری یا انسانی عقل کی کوتاہی کہ قوموں میں آپس میں دوستی اور تعاون کا جذبہ اتنا قوی نہیں ہے جتنا رقابت اور مسابقت کا جذبہ۔ دوسری قوموں کے خوف اور اپنی قوم کے غلبہ اور ہوس کی وجہ سے دنیا میں تصادم اور کشمکش کی ایک مستقل کیفیت موجود رہتی ہے، صرف اس بحران کا درجۂ حرارت بدلتا رہتا ہے۔ بڑی قوموں میں باہمی خوف کی شدّت اور توازن نے آپس کی جنگ کو روک رکھا ہے، ایسا زمانہ کم ہی گذرا ہے جب دنیا کے کسی نہ کسی حصّہ میں چھوٹی قوموں میں جنگ جاری نہ ہو اور چھوٹی قوموں کی کوئی جنگ ایسی نہیں ہے جس میں بڑی قومیں اپنے جارحانہ اغراض و مقاصد لے کر براہِ راست یا بالواسطہ شریک نہ ہوں۔

دفاعی طاقت کی اوّلین بنیاد تو ملکی اور قومی دفاع کی ضرورت کا احساس ہے، جس طرح ہر شخص کسی نہ کسی خاندان کا فرد ہوتا ہے اسی طرح وہ آج کل کی قومی ریاستوں کی دنیا میں کسی نہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے اور یہ تعلق اتنا ناگزیر ہے کہ اس کو مشکل سے ہی بدلا جا سکتا ہے، اور چونکہ ایک قوم کا دوسری قوم پر تسلط استحصال ہی کی صورت اختیار کر سکتا ہے، اس لیے قومی دفاع ایک حیاتیاتی مجبوری ہے۔ اگر کوئی فرد اپنے ملک یا قوم کا دفاع نہ کرے تو کیا کرے۔ بصورتِ دیگر اس کا نتیجہ قومی موت ہے۔ کسی کو اپنے ملک یا قوم سے کتنی ہی شکایت کیوں نہ ہو لیکن اپنوں کا ظلم غیروں کی غلامی سے بدرجہا بہتر ہے اور زندگی کی سختیاں خودکشی کا جواز نہیں پیدا کرتیں۔

یہ تو تھی دفاعی طاقت کی منفی اور جبری بنیاد۔ دینِ اسلام فطری جبر میں سے اخلاقی اختیار کی سبیل پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ دفاعی طاقت کی بھی مثبت اخلاقی بنیاد کو واضح کرتا ہے۔ تمام عالموں کے رب کی عبادت جہاں ایک طرف دل کو غیروں کی نفرت سے پاک

کرتی ہے وہاں وہ ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کی غلامی سے آزادی کا چارٹر بھی ہے، اور انسانی مساوات کا اعلان ہے۔ آدمی آدمی میں فضیلت کا معیار نہ دولت ہے نہ خاندان نہ جاہ و مرتبہ بلکہ تقویٰ ہے۔ افلاس اور مسکنت کو دور کرنے کی تمام معاشرہ پر انفرادی و اجتماعی ذمہ داری ہے۔ معاشرہ کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر یا کسی طبقہ کا دوسرے طبقہ پر ظلم نہ ہو بلکہ ہر شخص کی خواہش قانونِ الٰہی کی تابع ہو۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاشرہ اخوت کے رشتوں میں بندھا ہوا ہے، اور پوری ملّت ایک خاندان کی طرح ہو۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی ذمہ داری کی کش مکش سیاست کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اس قومی آزادی کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر گروہ کس حد تک اپنے آپ کو قومی آزادی میں شریک سمجھتا ہے، اور فرد اور ملّت میں کس درجہ ایسا ربط موجود ہے کہ ہر فرد ملت کا ایک جزو لاینفک اور اس کے سینہ کی ایک دھڑکن بن جائے۔ ظاہر ہے کہ جس حد تک فرد اور ملّت میں یہ رشتہ استوار ہوگا۔ اسی حد تک وہ ملّت ناقابل تسخیر ہے، اس لیے کہ ہر فرد ملّت کا دفاعی حصار ہے، اور جب تک ایک فرد بھی باقی ہے ملّت مضبوط ہے۔

میدانِ بدر کے مجاہدوں کی دفاعی فداکاریوں کا راز یہ خوف نہیں تھا کہ ہمیں اگر شکست ہوگئی تو غلام بنالیا جائے گا۔ مشرکین تو کہتے ہی یہ تھے کہ ہم سے کٹ کر علیحدہ ہو گئے ہو ہم میں پھر آکر مل جاؤ۔ ان کی فداکاری کا راز یہ یقین تھا کہ زندگی میں اگر کوئی معنی ہیں تو اسی صورت میں کہ اس ملّت کی تعمیر میں اس کو صرف کیا جائے۔ زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس ملّت کی بقا کی خاطر اس کو قربان کر دیا جائے۔ وہ اس ملّت سے ہٹ کر اپنے آپ کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لیے تسلیم جان تو عشق کی ایک مجبوری تھی۔

دفاعی طاقت اتحاد میں ہے۔ جس حد تک معاشرہ میں عدل و احسان کی صفات عملی طور پر موجود ہوں گی۔ جس حد تک ایک مقصد پر ایمان و یقین اور اس کے حصول کے لیے شرکتِ عمل ہوگی اسی حد تک اس ملّت میں اتحاد ہوگا۔ اس بنیاد کے بغیر اتحاد کی کوشش ریت کا قلعہ تعمیر کرنا ہے۔ اسلام جس اتحاد کو چاہتا ہے وہ نہ منفی ہے نہ وقتی کسی خطرہ

کے وقت آپس میں جمع ہو کر اس خطرہ کو دفع کرنے کی کوشش کرنا تو جانوروں کی بھی خصوصیت ہے، ایسے اتحاد کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایسے اتحاد کو شکست کا ایک جھٹکا پاش پاش کر دیتا ہے اور خطرہ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن عدل و احسان، ایمان و عمل سے جو اتحاد پیدا ہوتا ہے وہ شکست کی صورت میں عزم میں پختگی اور فتح کی صورت میں حوصلہ میں بلندی پیدا کرتا ہے۔ اگر ملت میں ان صفات کا فقدان ہو تو اس میں بلند مقاصد کی جگہ ذاتی یا علاقائی یا طبقاتی مفادات، ایثار کی بجائے خود غرضیاں، صالح عمل کی جگہ فساد اور سازشیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور اس میں داخلی اور خارجی فتنوں کے خلاف مقاومت اور مدافعت کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ اسلام میں جہاد کسی وقتی مسئلہ کے حل یا ہنگامی حالت کے تدارک کے طور پر نہیں بلکہ زندگی کے فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے ساتھ ہی جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ ہے۔ یہ اللہ کا امتحان ہے جس کے بعد ہی مومن اللہ کی رحمت کا امیدوار اور اس کی ہدایت کا حقدار بنتا ہے۔ یہ جنت میں داخل ہونے کی شرط ہے۔ مومن کی نشانی یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ کو اپنے تمام دنیوی رشتوں ناطوں، کاروبار، مال و منال سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ یہاں ملٹری اور سویلین کا امتیاز نہیں ہے۔ اسلام میں جہاد پیشہ نہیں بلکہ عبادت ہے۔ سپاہی بننا ہر مسلمان کا فرض ہی نہیں بلکہ حق ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کا ایک لازمی جزو — ہر شخص کی فوجی تربیت ہے۔ آبادی کے ایک بڑی حصہ کو اگر فوجی تربیت سے محروم رکھا جاتا ہے تو قوم میں خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا مزاج آزادی کی ذمہ داریاں اور دشواریاں بخوشی قبول کرنے کی بجائے غلامی کی سی بیچارگی اور معذوری اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی ذلت پر مائل ہو جاتا ہے، اور فوج میں آمرانہ رجحانات اور ترغیبات کے ابھرنے کے قوی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس تفریق کا شہریوں اور فوجیوں دونوں پر مضر اور غیر صحت مندانہ اثر پڑتا ہے۔ آج کے زمانہ میں جب جنگ کسی میدان تک محدود نہیں بلکہ گھر اور بازار بھی جنگ کا محاذ بنتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اور بھی خطرناک بلکہ مہلک ہے۔

ویسے بھی فوجی تربیت ملک کی خدمت میں عملی شرکت کے احساس کو گہرا کر کے آپس میں اتحاد کو اور فرد کی ملک سے وابستگی کے جذبہ کو قوی تر بناتی ہے۔

دفاعی طاقت پر زور دینے کے لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دشمنوں کے مقابلہ کے لیے استطاعت بھر اپنی قوت بہم پہنچائیں اور لڑائی کے تمام اسباب و ذرائع اور صلاحیتیں مہیا رکھیں صلح کی طرف مائل رہیں لیکن دفاعی تیاریوں کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ رہیں۔ غفلت اور کمزوری دشمنوں کو دعوت دیتا ہے۔ دفاعی قوت کی موجودگی دانستہ یا نادانستہ دشمنوں کے حوصلے پست رکھتی ہے۔ اس حکم میں اپنے وسائل کو حتی الامکان بروئے کار لانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جب ایک ایمان و عزم رکھنے والی قوم حسبِ استطاعت اپنے دفاع کی تیاری کرتی ہے تو وسائل کی کمی کے باوجود وہ قوی اور دشمن کے مقابلہ میں کامیاب ہوتی ہے، مثالیں تمھارے سامنے ہیں کہ حسبِ استطاعت اپنے دفاع کا عزم چھوٹی طاقتوں کو کس طرح کہیں زیادہ بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں کامیاب کرتا ہے۔ ایسی قوموں کی نصرت بھی ہوتی ہے، اور تمام نصرت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پست حوصلہ اور ظالم اور غافل قومیں کسی نصرت کی حقدار نہیں ہیں۔ تاریخِ عالم بار بار اس حقیقت کی تصدیق کر چکی ہے کہ اکثر قلیل گروہ کثیر جماعت پر غالب آتے ہیں، اور جب کوئی قوم حسبِ استطاعت کوشش کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی استطاعت میں حیرت انگیز وسعت پیدا کر دیتا ہے۔

توکل علی اللہ اور حسبِ استطاعت جد و جہد دفاع اور جہاد کے لازمات ہیں۔ بیشک بھوک سے سیری اور خوف سے امن کی منزل تک پہنچنے کی تدبیر محض ربِ کعبہ کی عبادت ہے۔ اس تدبیر کے علاوہ تم دنیا میں جو بڑی طاقتیں سمجھی جاتی ہیں ان کی حالت دیکھ لو۔ خوف کو دُور کرنے کی جو تدبیریں کی جاتی ہیں وہ خوف کو اور بڑھاتی ہیں، اور بھوک کو دُور کرنے کی جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان سے بجائے سیری کے جوع الارض اور ہوس کی آگ اور بھی بھڑکتی ہے۔

ہجرت اور وطنیت

وطن سے محبّت ایک فطری جذبہ ہے جو یگانگت اور قرابت اور قربتِ مکانی سے ابھرتا ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اور اپنے خاندان، قبیلہ میں، اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے زیرِ سایہ اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ پلتا بڑھتا ہے، یا جس خطّہ ارض پر اسے تمکن حاصل ہوتا ہے اس مقام سے محبت ہونا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، ایک فرد کی زندگی اپنے سماجی اور جغرافیائی ماحول سے اتنے مادی اور غیر مادی رشتوں کے ذریعہ وابستہ ہوتی ہے کہ ایک خطۂ زمین اور اس پر رہنے والے مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ انسان دوستی کے عظیم ترین دائرہ کا پہلا نقطہ اپنے پڑوسی سے دوستی ہے۔ جس شخص کو اپنے وطن سے محبت نہیں ہے اس کا انسان دوستی کا دعویٰ ایک انسانیت سے عاری تجریدی تصوّر ہے۔

دینِ اسلام انسان کے اخلاق وسیرت کی تعمیر فطری تقاضوں اور ضرورتوں کی نفی پر قائم نہیں کرتا بلکہ فطری حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے اور ان کے حدود مقرر کر کے ان کی تہذیب کرتا ہے اور ان کی تکمیل کے لیے صحیح راستہ متعین کرتا ہے اور یہی اخلاقی تربیت ہے۔ دینِ اسلام شعوب وقبائل کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن یہ بتاتا ہے کہ یہ اختصاص اس لیے ہے کہ ایک فرد پہچانا جائے شرفِ انسانی کا معیار یہ نہیں ہے بلکہ شرفِ انسانی کا معیار تقویٰ ہے۔ دینِ اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اپنے والدین کے ساتھ، اپنے قرابت داروں کے ساتھ، یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ، رشتہ دار، پڑوسی اور اجنبی پڑوسی یعنی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ، اپنے ساتھیوں اور مسافروں کے ساتھ، اپنے زیر دست لوگوں کے ساتھ احسان کا سلوک کریں۔ تمکّن فی الارض کو یعنی زمین کے کسی خطّہ پر آزادی اور استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت قرار دیتا ہے جس کا شکر ہم پر واجب ہے۔ اور اس حب الوطنی کے اظہار کا طریقہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ الصّلوٰۃ کو قائم کریں جو سیاسی

اصطلاح میں ایک انسان کی دوسرے انسان کی غلامی سے آزادی اور برتری اور کمتری کے امتیاز سے نجات کے مترادف ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کریں جس کا معاشی پہلو یہ ہے کہ افلاس دور ہو اور معاشی ناہمواری کم ہو۔ ذلت اور مسکنت سے نجات ہو، آپس میں عدل قائم ہو کہ اس کے اوپر تمام معاشرہ کے امن و استقلال کا دارومدار ہے۔ اس سے ایک درجہ آگے بڑھ کر احسان کی فضا قائم ہو جو اخوت و مواخات کا مقام ہے۔ اچھی باتوں کی ترویج ہو۔ بُری باتوں کا انسداد ہو۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا گویا اس زمین کا حق ادا کرنا ہے جو ہمارا وطن ہے اور نعمت کا شکر ادا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک خطۂ ارض پہ تمکن سے نوازا ہے۔

حب الوطنی کے اظہار کے اس طریقے سے ہماری وطن سے محبت کی تطہیر بھی ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک گہرائی اور معنویت بھی پیدا ہوتی ہے۔ سچے محبِ وطن اپنے وطن کے معاشرہ میں عدل و احسان، آزادی اور مواسات کی فضا کو قائم کرتے ہیں۔ ذلت اور مسکنت اور افلاس کی لعنتوں کو دُور کرنے کی سعی کرتے ہیں، سماجی ناہمواریوں کو ختم کرتے اور ایک ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں نیکیاں اور اچھائیاں پروان چڑھیں اور ظلم کو اس کی کسی بھی صورت میں ابھرنے کے مواقع ختم ہوں اور اسی کو اپنا نصب العین قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہم وطنوں میں اتحاد پیدا ہوگا اور ہماری وطن سے محبت اور زیادہ گہری ہو جائے گی۔

اتحاد اشراکِ عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ہمیں اسی چیز سے گہرا لگاؤ قائم ہوتا ہے جس کے لیے ہم کچھ ایثار اور قربانی کریں۔ اگر ہم اپنے ہم وطن کو اپنے مفاد اور تمتع کی خاطر استعمال کریں اور اس بات کا قطعاً لحاظ نہ رکھیں کہ ہمارے انفرادی عمل کا اثر ہمارے ہم وطنوں کی زندگی پر کیا پڑ رہا ہے تو معاشرے میں انتشار پیدا ہوگا اور ہماری وطن کی محبت کا رشتہ کمزور پڑ جائے گا۔ ظلم کا نتیجہ ہر جگہ فساد ہوتا ہے اور استحصال ہوس سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں ہوس ہوتی ہے وہاں محبت نہیں ہوتی۔ ہوس خود غرضی کا ہتھیار ہے۔ محبت خدمت اور ایثار کا تقاضہ کرتی ہے۔ اسلامی معاشرہ جامد معاشرہ

نہیں ہے بلکہ متحرک معاشرہ ہے اور اس میں حرکت کی قوت یہی نصب العین ہے۔ اِس نصب العین کے لیے جدوجہد کیے بغیر ہمارے تمام وطن دوستی کے دعوے غیر معتبر ہیں۔

یہ نصب العین اس قدر اہم ہے کہ اگر یہ پورا نہ ہوتا ہو تو اس کو پورا کرنے کی خاطر ہمیں ہجرت کا حکم ہے۔ اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو مستضعفین میں سے ہوں یعنی وہ مرد، عورتیں اور بچے جو اس قدر بے چارہ اور بے سہارا ہوں کہ وہ اس ظلم سے نجات پانے کے لیے کوئی حیلہ یا سبیل ہی نہ پائیں۔ لیکن ہجرت اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ دینے کو نہیں کہتے۔ یہ ہجرت نہیں ہے کہ اگر ہماری صلاحیتوں کی قیمت غیر ملکوں میں زیادہ لگ رہی ہو تو ہم اپنے ملک کو جس کو ہماری صلاحیتوں کی ضرورت بھی ہو ان صلاحیتوں سے محروم کر دیں جن کو حاصل کرنے میں ہمارے ملک کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اور غیر ملکوں میں جو کبھی ہمارا وطن نہیں بن سکتے بود و باش اختیار کریں۔ ہجرت ذاتی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے نصب العین کی خاطر ہوتی ہے۔ ہر ہجرت درحقیقت ہجرت الی اللہ یا ہجرت فی سبیل اللہ ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم کو چند باتیں نہیں بھولنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہجرت کی فضیلت اس حقیقت کو فرض کرتی ہے کہ ہمیں اپنے وطن سے محبت ہے۔ اگر اپنے وطن سے محبت نہ ہو تو ترکِ وطن میں ایثار کا پہلو کہاں پیدا ہوا اور بغیر ایثار کے فضیلت کا جواز کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہجرت میں ایک وطن کو چھوڑا جاتا ہے تو دوسری جگہ کو وطن بنایا جاتا ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں میں گھل مل کر ایک زیادہ ہم آہنگ اور صحت مند معاشرہ کی تشکیل کی جائے۔ حضورؐ اس بات کی دعا مانگتے تھے کہ خدا مکّہ کی محبت کو ذرا دل سے کم کر دے اور اس سے زیادہ مدینہ کی محبت دل میں پیدا کر دے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہجرت کے بعد اگر ہجرت کے مقصد اور اپنے نصب العین کو بھلا دیا گیا اور لوگ اپنے ذاتی مفادات کو پورا کرنے میں لگ گئے اور عدل و اخوت پر مبنی معاشرے کی تشکیل کرنے کی بجائے ظلم و استحصال کی نئی راہیں کھلنے کا باعث بن گئے تو یہ اپنے خدا اور اپنے نفس کے ساتھ دھوکا ہے۔

وطنیت یا قومیت کے اس تصور میں جو مغرب میں سترھویں صدی میں ابھرنا شروع ہوا اور انقلابِ فرانس کے بعد اور زیادہ قوی ہو گیا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے کئی پہلو

محلِ نظر ہیں۔ مثلاً وطن سے محبّت ایمان کا جزو ہے۔ لیکن وطن کو بُت بنا کر پوجنا شرک ہے۔ میرا ملک صحیح یا غلط کے نعرے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اپنے ملک کے لیے ایک نظامِ اخلاق اور دوسرے ملک سے متعلق دوسرا ضابطۂ اخلاق اختیار کرنے کی کوئی سند نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں پر جارحیت اور سامراج کا قیام مذموم ہے۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ جو لوگ تم سے دین میں نہیں جھگڑتے اور تمھیں انھوں نے دیار سے نہیں نکالا ہے تو ان سے بھلائی اور انصاف کرنے سے اللہ تعالیٰ تمھیں منع نہیں کرتا بلکہ یہ تاکید ہے کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں زیادتی کرنے پر نہ ابھارے اسی طرح اپنے ملک کے اندر سب کے ساتھ عدل اور انصاف اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں، ظالموں کے خلاف ان لوگوں کے خلاف جو "دین" میں تم سے جھگڑتے ہیں اور حق و انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، خواہ وہ خارجی دشمن ہوں یا تمھارے معاشرے کا ہی کوئی گروہ ہو جہاد کرنے کی ترغیب ہی نہیں بلکہ تاکید ہے۔

غرض اسلامی نقطۂ نظر سے وطنیت کا ایک طرف تقاضہ یہ ہے کہ ہم پڑوسیوں سے جو ہمارے رشتہ دار ہوں یا اجنبی ہوں حسنِ سلوک سے پیش آئیں اور دائرہ کو وسیع کریں اور اس طرح مقامی اور علاقائی تعصبات کو دور کرنے کی سبیل پیدا کریں کہ اس بات میں ہمارے علاقہ کا، ہماری بستی کا، ہمارے محلہ کا بلکہ ہمارا مفاد مضمر ہے۔ دوسری طرف وطنیت کا تصوّر عالمی برادری کے ارتقا میں رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ مُمِدّ و معاون ہے۔ جب تک ایک قوم اور دوسری قوم کے مابین تعلقات حق اور انصاف پر مبنی نہ ہونگے بلکہ وقتی مفادات کے تابع ہونگے اس وقت تک عالمی امن قائم نہیں ہو سکتا، اس دنیا میں سوائے انصاف کے امن کی اور کوئی بنیاد نہیں ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم دوسری قوموں سے جب انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا ہے، دوستی اور انصاف کے تعلقات رکھیں اور دشمنی کے باوجود کسی پر زیادتی نہ کریں اور آخری اور اہم ترین بات یہی ہے کہ وطن دوستی کے اظہار کا صرف ایک ہی صحیح طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے وطن سے ذلّت و مسکنت کو دُور کریں۔ آزادی اور مساوات کی فضا قائم کریں۔ عدل اور احسان کو رائج کریں تاکہ معاشرہ ایک خیر سے دوسرے خیر تک ترقی کرتا جائے۔ یہ وطن دوستی کے اظہار کا طریقہ بھی ہے اور وطن دوستی کے فطری جذبہ میں معنویت اور حقیقت اور گہرائی پیدا کرنے کا ذریعہ بھی۔

اخلاق

وقت کی قدر و قیمت

وقت کی قدر و قیمت وقت کے صحیح استعمال میں ہے۔ ہر شئے کی قیمت اس کے صحیح استعمال میں ہوتی ہے۔ وقت کی قدر نہ کرنا زندگی کو باطل اور بے مقصد و بے حقیقت سمجھنا ہے، اگر زندگی کا کوئی مقصد ہے اور انسان کو کچھ بننا یا کچھ کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ زندگی وقت کی ایک مدت سے عبارت ہے اور وقت کا صحیح استعمال کرنا اس کے لیے فرضِ عین بن جاتا ہے۔ کلامِ پاک میں بار بار اس پر زور دیا گیا ہے کہ دنیا کو باطل یا بے مقصد نہیں پیدا کیا بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں یہ کوئی کھیل ہے بلکہ دنیا حق اور باطل کی رزمگاہ ہے۔ جن و انس کو پیدا کرنے کا منشا ایک جامع لفظ "عبادت" کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ موت اور زندگی کو اس لیے بنایا گیا ہے کہ لوگ آزمائے جائیں کہ احسن عمل کون کرتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو کچھ آدمی کرتا ہے اس کی مکافات لازمی ہے۔ عمل اور اس کی مکافات کا تعلق اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا گیہوں سے گیہوں اور جَو سے جَو کا پیدا ہونا، انسان میں اس بات کی صلاحیت بھی ہے کہ وہ حیات کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ جائے اور یہ رجحان بھی موجود ہے کہ وہ جانوروں سے بھی نیچے درجے تک اتر جائے، اور یہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس نے وقت کی قدر کی ہے یا اس کو ضائع کیا ہے۔

زندگی کا شرف اور اس کی بزرگی اس کی کیفیت میں ہے۔ کمیت میں نہیں ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ اس نے کتنی چیزوں کو اپنے چاروں طرف جمع کیا اور ان پر تصرف کر کے ان سے لذت اندوز ہوا بلکہ اس کی بڑائی اس میں ہے کہ اس نے اپنی زندگی کس طرح گذاری اور وہ کس حد تک خلقِ خدا کی فلاح و بہبود میں مصروف رہا۔ قرآن شریف میں حلال ذرائع سے اسبابِ معیشت کو جمع کرنے کو اللہ کے فضل کی جستجو بتایا ہے۔ لیکن ہوس اور غرض کے چکر میں پڑ کر مال و دولت کو جمع کرنا یا کثرتِ اشیاء میں سرگرداں

رہنا تاکہ ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر کیا جاسکے اور شان جتائی جاسکے۔ اللہ کی نگاہوں میں بہت مذموم ہے، اس کو حیاتِ دنیا کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حیاتِ دنیا سوائے لہو ولعب کے اور کچھ نہیں ہے، یہ وقت کا سب سے غلط استعمال ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کہ اسی مال و دولت کی ہوس نے، اور خود غرضیوں نے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں شان جمانے اور فخر کرنے کی خواہش نے ہمارے ملک اور ہماری قوم کو کس حد تک پہونچا دیا۔ وہی وقت جو خدا کے فضل و رضوان کی تلاش کرکے اپنی ذلت و مسکنت کو دور کرنے میں خوف سے امن کی حالت تک اور بھوک سے سیری کی حالت تک پہنچنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے لہو ولعب میں ضائع کر دیا۔

قرآنِ حکیم کی رو سے وقت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اوّل تو انسان وقت کی پابندی کے ساتھ عبادات بجا لائے، ہر عبادت کا ایک وقت مقرر ہے۔ روزی کی عبادت یعنی نمازوں کے اوقات مقرر کر دیئے گئے ہیں، اور تاکید یہ ہے کہ نمازوں کو ان کے اوقات پر ادا کیا جائے۔ یہ گویا روزمرّہ کے کاموں میں نظم اوقات کی شیرازہ بندی ہے۔ کسی معاشرہ میں صحیح معنی میں نماز باجماعت کا قیام، تمام امور میں نظم اور پابندی کر دے گا۔ عبادت کرتے وقت شعوری طور پر اس بات کو تجربہ کرنا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ عبادت ہماری زندگی کی آخری عبادت ہو یا ممکن ہے قیامت کی ساعت نزدیک ہو، گویا وقت کی ناپائیداری کا شعور وقتِ تہیّا کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کا ذریعہ ہے۔

عبادات کے بعد معاملات کا درجہ ہے، طولِ امل سے یعنی اپنی ضروریات اور خواہشات کو بلا ضرورت پھیلائے اور اپنی حرص کو بے لگام چھوڑ دینے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ قناعت کے منافی ہے اور اس سے اعمال فاسد ہو جاتے ہیں۔ اپنی محنت سے حلال اور جائز ذرائع سے اپنی روزی پیدا کرنا اللہ کے فضل کی تلاش، جو لوگ روزی پیدا کرنے میں ہمارے شریکِ کار ہیں ان سے پورا پورا انصاف کرنا ہے، دوسروں کو ان کا حق دینا ہے اور اپنا حق لینا ہے۔ یہ پوری ناپ تول ہے اپنے لینے اور دوسروں کو دینے کا پیمانہ ایک ہی ہو۔ اور چونکہ روزی کے ذریعے اللہ کا کرم ہیں اس لیے وقت ضائع کیے بغیر پوری محنت سے

کام کرنا اور اپنی کمائی میں اپنے اقربا کے علاوہ یتیم اور مساکین اور سائل اور محرومین کی مشکلوں کو دور کرنے کے لیے ایثار کرنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔

پھر ہمارے وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ہم معاشرے سے ظلم کو دور کریں اور عدل وانصاف کو قائم کریں۔ خلق اللہ کی بھلائی اور بہبود میں ایثارِ نفس اور ایثارِ مال کریں۔ عدل اور احسان کے تقاضوں کو پورا کریں، انفرادی اور اجتماعی سطح پر پورا کریں، نیکیوں کو پھیلائیں، برائیوں کو روکیں۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، نیکی کے کام کرتے وقت ان کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ نیکیاں باقیات الصالحات ہیں۔ جب نیکی کرو تو وقت کو فانی نہیں جاودانی سمجھو۔ اگر تمھیں یہ یقین بھی ہو جائے کہ آئندہ ساعت قیامت ہے اور تمھیں اتنی فرصت مل جائے کہ تم نیکی کا کوئی بیج بو سکتے ہو تو ضرور بو دو۔ مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں ؎

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
ہر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اگر وقت کو غفلت یا لہو ولعب میں گذارا جائے تو وقت کس قدر قلیل ہے۔ شغلۂ ہوس کو فروغ بھی نہیں ہونے پاتا کہ وقت کا جھونکا اس کو بجھا دیتا ہے۔ اگر اس کو تزکیۂ نفس، عملِ صالح اور علم وحکمت کے اکتساب میں صرف کیا جائے تو اس میں کتنی وسعت ہے۔ اسی وقت میں سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ امیر المومنین علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "دنیا کو بُرا مت کہو۔ دنیا اس کے لیے سچائی کا گھر ہے جو اس سے سچا ہے، جو اس کو سمجھ گیا اس کیلیے دارِ عافیت ہے، جو اس سے زادِ سفر لے اس کے لیے دارِ غنا ہے، جو اس سے نصیحت و عبرت حاصل کرے اس کے لیے دارِ موعظت ہے۔ دوستانِ خدا کی مسجد ہے، ملائکہ کا مصلّیٰ، ولی کی منزل ہے، دنیا اولیا اللہ کی تجارت گاہ ہے جس میں وہ رحمت کماتے ہیں اور جنّت کا نفع اٹھاتے ہیں۔"

وقت کی قلت کی شکایت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم نے اس کی صحیح قدر وقیمت نہیں کی، اگر اس کی صحیح قدر وقیمت کی جائے تو اس کی وسعت لامتناہی ہے۔ کچھ نہ کرنے

کے لیے یہ عذر پیش کرنا کہ اتنے سے وقت میں کیا کیا جا سکتا تھا۔ یا یہ کہنا کہ پچیس سال کی مدّت تو ایک قوم کی تاریخ میں ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے آپ کو فریب دینا ہے قوموں کی زندگی میں انقلابات صدیوں کی مدت پر نہیں پھیلتے بلکہ ہمیشہ قلیل مدّت میں ہی آیا کرتے ہیں۔ صدیوں تک تو اس انقلاب کے مضمرات و عواقب پھیلتے رہتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے انقلاب یعنی ظہورِ اسلام سے قطعِ نظر جس نے تیئیس برس کی مدّت میں زمین و آسمان [illegible] بدل گئیں۔ اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالو کہ وقت کی قدر و قیمت کرتے سے دیکھتے دیکھتے دنیا کی کئی قومیں کہاں سے کہاں پہونچ گئیں، یہ گمان کرنا کہ دوسری قومیں ہم سے صدیوں آگے ہیں، اور اس فاصلے کو پورا کرنے کے لیے وقت درکار ہے ایک غلط فہمی پر مبنی ہے وقت کی رفتار پُرانی قوموں میں سست پڑ جاتی ہے۔ ظاہری زندگی کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے لیکن حقیقت میں اقدار کی تخلیق رک جاتی ہے اور تخلیق اقدار ہی حقیقت میں تخلیقی عمل ہے۔ ظاہری شان و شوکت کے باوجود بسا اوقات ان میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ نئی ابھرتی ہوئی قوموں میں وقت کی رفتار تیز ہوتی ہے اور زندگی کی سمت روبہ ترقی ہوتی ہے۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت ایران اور روما کی تہذیبیں عرب سے کتنی صدیاں آگے تھیں اور اس فاصلے کو پورا کرنے میں وارثِ زمین بننے میں عرب کو کتنی مدت درکار ہوئی، افراد ہوں یا اقوام جو وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اس کو زوال اور موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، جو ایمان اور یقین کے ساتھ عملِ صالح کرتا ہے اور مل کر سچائی کے راستہ پر استقلال کے ساتھ گامزن ہوتا ہے۔ وہ اس ہلاکت اور تباہی سے بچ جاتا ہے اور زندگی کی بلند ترین منازل کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وقت ایک تلوار ہے جو اس کا صحیح استعمال نہیں جانتا، تلوار اس کو ہلاک کر دیتی ہے، جو اس کا صحیح استعمال جانتا ہے، وہ اسی وقت کی تلوار سے کائنات کو مسخر کر لیتا ہے۔

والعصر ○ ان الانسان لفی خسر ○ الا الذین آمنوا
وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ○

عزم و استقلال

اگر کوئی انسان بغیر کسی مقصد کا تعین کیے ہوئے بلا ارادہ زندگی کے شب و روز بسر کرتا ہے تو اس کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے، کیونکہ جانوروں کے لیے زندگی کی ایک نہج مقرر ہے جس پر وہ بے ارادہ اور بے اختیار اور بغیر کسی ذمہ داری کے چل رہے ہیں اور ان کے لیے گمراہی و بے راہ روی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انسان کو اختیار دیا گیا ہے اور اسی اختیار کے مطابق اس کو ذمہ دار بتایا گیا ہے۔ وہ مختار اور ذمہ دار ہونے پر مجبور ہے، کیونکہ اس کو اسی جبلّت اور فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا بلا ارادہ زندگی بسر کرنا بھی ایک ارادہ ہے، اس کا اختیار کو استعمال نہ کرنا بھی ایک اختیار ہے کیونکہ اگر وہ چاہے تو اختیار کو استعمال کر سکتا ہے۔ زندگی کا کوئی مقصد متعین نہ کرنا بھی اس کے لیے ایک مقصد بن جاتا ہے۔ بس فرق اتنا ہوا کہ وہ انسان ہو کر جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور چونکہ وہ انسان ہے اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ جانوروں کی سی زندگی بسر کر سکے۔ اس کے لیے بے راہ روی بھی گمراہی ہے۔

دین کے مسلمات میں سے ایک یہ بنیادی حقیقت ہے کہ اس کائنات کو بیکار یا لہو و لعب کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا ہے، یہ دنیا اور اس میں ہماری زندگی بے معنی اور مہمل نہیں ہے۔ جس میں ہم اپنی خواہش اور ارادے سے کوئی معنی پیدا کریں اور اپنے عمل کے لیے سوائے اپنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار نہ ٹھہرائیں۔ بلکہ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ ایک مدّت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، اور ایک مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے جس کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے۔ موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ ہم آزمائے جائیں کہ احسن عمل کون کرتا ہے۔ اسی کے سامنے ہم ذمہ دار ہیں۔

صراطِ مستقیم کی وضاحت کرنے کے بعد یہ اس کی مشیّت ہے کہ انسان اپنے لیے پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک راستہ اختیار کرے اور اس کی رضا یہ ہے کہ انسان صراطِ مستقیم کو اختیار

کرے تاکہ وہ باطل سے حق کی طرف، اندھیرے سے روشنی کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف آسکے اور دنیا و آخرت میں حسنات کا امیدوار ہو سکے۔ کیونکہ انسان جب کسی بات کا عزم کرتا ہے خواہ بات اچھی ہو یا بری ہو اور اس کے لیے سعی کرتا ہے تو کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر اس کا بڑا گہرا اثر اس پر اور اس کے ماحول پر ضرور پڑتا ہے۔ ہر عمل کا ردِ عمل لازمی ہے، اس لیے کوئی عزم کرنے سے پہلے انسان کو لازم ہے کہ وہ اس راستے اور منزل پر اچھی طرح غور کرلے جس کا اُس نے عزم کیا ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان اپنی خود غرضی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے عزم و عمل کی تمام قوتیں منفعت کی اشیاء فراہم کرتے ہیں صرف کردے۔ اپنی قوت اور کثرت اور دولت اور اسبابِ تعیش میں اس کے لیے ایک کشش اور زینت ہو اور انہی کو بڑھانے میں وہ منہمک ہو جائے۔ ان چیزوں کو جو حیاتِ دنیا کی متاع ہیں وہ مقصدِ حیات سمجھنے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ کے خزانے میں تو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس عزم و ارادے میں ناکام ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ کامیاب ہو جائے، اگر وہ ناکام ہوا تو دنیا و آخرت کی رسوائی اور خسران اس کا مقدر رہے، اور اگر وہ کامیاب بھی ہو گیا تو یہ چیزیں آخر قائم رہنے والی نہیں ہیں، نہ ان کی ہوس کبھی ختم ہو سکتی ہے۔ بلکہ ان چیزوں کی بہتات کے ساتھ ہوس بھی بڑھتی ہے، اور انسان کو سیری یا امن کا اطمینان و قناعت کا ایک لمحہ بھی میسّر نہیں آسکتا، یہ وہ بازار نہیں جہاں وہ گوہرِ نایاب جسے سکینۃ القلب یا نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ دستیاب ہو سکے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لیے اس نے بندگانِ خدا کے حقوق غصب کیے ہوں۔ اور ظلم کیے ہوں۔ اور ہر قسم کے ظلم کا نتیجہ معاشرے میں فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس فساد میں ہر شخص مبتلا ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ بات تو یقینی ہے کہ زندگی کے مقصدِ اعلیٰ سے غفلت برتنے اور بندگانِ خدا پر ظلم کرنے اور اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے کے سنگین جرم اور گناہ میں وہ ماخوذ ہو گیا۔ ان محبوب و مطلوب اشیاء کو قرآنی اصطلاح میں عاجلہ کہتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ جو شخص عاجلہ کا عزم و ارادہ کرتا ہے تو ہم جو چاہتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں سر دست عطا کر دیتے ہیں مگر پھر اس کے لیے جہنم

تو ٹھہرا ہی رکھا ہے کہ اس میں وہ بُری حالت میں راندا ہوا داخل ہوگا۔

لیکن جہاں انسان میں خود غرضی کا مادہ تحفظ اور بقائے حیات کے لیے رکھا گیا ہے۔ وہیں ایثارِ نفس کے داعیات بھی ارتقائے حیات کے لیے ودیعت کیے گئے ہیں، تو دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنے ایثارِ نفس کے داعیات کو ابھارتے ہوئے اور انھیں تقویت پہونچاتے ہوئے اپنے عزم وعمل کی تمام قوتیں اپنی شخصیت کی تعمیر میں اور انسانیت کی اصلاح میں۔ اپنے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب اور اپنے ماحول کی صلاح وفلاح میں صرف کردے۔ یہ جان و مال کا بذل وکرم ایک مومن کا اللہ تعالیٰ سے سودا ہے جس میں خسارے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اگر بظاہر کامیابی ہے تو وہ ہے ہی کامیابی اور اگر ہم اس کامیابی کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کا شکر ادا کریں اور کفران نہ کریں تو یہ ایک کامیابی اس سے عظیم تر کامیابی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اور اگر راستے میں کچھ رکاوٹیں بھی آتی ہیں تو وہ رکاوٹیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں اور امتحان اس کی رحمت کا بہانہ ہوتا ہے۔ جس مقام پر بظاہر شکست نظر آتی ہے وہیں سے فتحِ مبین ابھرتی ہے۔ ان مقاصد کو قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں عاقبہ یا آخرہ کہتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اور جو آخرہ کا عزم اور ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جیسی کہ کوشش کرنی چاہیے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں مقبول اور مشکور ہیں۔

فرد کے لیے جو حقیقت ہے اس پر قوم کی حالت کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ جو قوم من حیث القوم اپنے سامنے کوئی مقصد نہیں رکھتی یا اگر کسی مقصد کا زبان سے اقرار ہے تو عمل سے انکار کرتی ہے۔ نہ اس کا کوئی عزم یا ارادہ ہے اور وہاں ہر فرد اپنی فوری منفعت اور تمتع کے اسباب کو مہیا کرنے میں مصروف ومنہمک ہے اور قوم من حیث القوم ایثارِ جان ومال سے اور اپنے دل ودماغ اور اعضاء وجوارح کی محنت ومشقت سے گریز کرتی ہے اور اس گمان میں مبتلا ہے کہ کسی حیلہ یا تدبیر سے اس کے وجود کا دفاع اور بقا ممکن ہوسکے گا تو ممکن ہے کہ اس قوم میں دولت کے چند ڈھیر لگ جائیں، اور کچھ طاقت وشوکت کے اسباب نظر آنے لگیں لیکن دولت برکت سے خالی اور فساد کی خبر ہوگی۔ اور ایسی طاقت کھوکھلی اور ناپائیدار ثابت ہوگی۔

لیکن اگر کوئی قوم اولوالعزم ہے اور اپنی محنت اور مشقت سے اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کی قدر کرتی ہے اور استقلال کے ساتھ آزادی اور مساوات اور اخوت اور عدل اور احسان کو قائم کرتی ہے اور نیک باتوں کی ترویج کرتی ہے اور بُری باتوں کو روکتی ہے اور مسلسل یہی کرتی ہے اور اپنے حدِ استطاعت تک حاسد اور ظالم قوموں سے اپنے تحفظ کا انتظام کرتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اس کے ہر فرد کی اپنے معاشرے سے نسبت اور تعلق قوی ہے اور ہر فرد اس نسبت اور تعلق پر فخر محسوس کرتا ہے، اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس قوم کو کتنے ہی سخت امتحانوں سے کیوں نہ گذرنا پڑے اور دنیا میں اس کے کتنے ہی دشمن کیوں نہ ہوں اور وہ دشمن کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں، اسکے دوامِ تمکن کا، اس کی عزت و جلال کا اس کے فلاح و بہبود کا ضامن خود اللہ تعالیٰ ہے۔

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رکاوٹیں اور مشکلیں، مخالفتیں اور مخاصمتیں، حوادث و مصائب ناگزیر ہیں اس لیے کہ زندگی کا راستہ انہی منازل سے گذرتا ہے۔ زندگی کا ہر موڑ ایک تقاضائے کو ظاہر ہوتا ہے۔ وقت ہر فرد اور ہر قوم کا امتحان لیتا ہے۔ اگر زندگی کے اس معرکہ میں علم و یقین، عزم و عمل، صبر و استقلال سے کام لیا جاتا ہے تو زندگی اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرتی جاتی ہے۔ اگر لوگ اپنی غفلت سے وقتی منفعتوں میں مشغول ہو کر وقت کے تقاضے کو نہیں دیکھتے اپنی جہالت سے یہ نہیں سمجھتے کہ کشادگی بھی ایک امتحان ہے اور تنگی بھی ایک امتحان ہے اور چھوٹے چھوٹے تنازعوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا عزم کمزور اور مقصد غیر متعین ہوتا ہے۔ ایک ہنگامی اور عارضی جوش میں تو ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں۔ لیکن خاموش منظم، مستقل اور پیہم کام کی صلاحیت ان میں مفقود ہے۔ ذرا حالات سازگار ہوئے تو اترانے لگتے ہیں۔ حالات ناسازگار ہوئے تو دل چھوڑ بیٹھتے ہیں تو ایسی قوم طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کی جاتی ہے، اور ذلت و مسکنت اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی مصیبتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو مصیبتیں تمھارے اوپر آتی ہیں وہ خود تمھارے اپنے ہاتھ کی کمائی ہوئی ہوتی ہیں، اور بہت سی لغزشوں اور تقصیروں کو تو اللہ تعالیٰ درگذر کر دیتا ہے۔ ایسی صورت درپیش ہو تو لازم یہ ہے کہ بجائے مایوس ہونے کے انسان اپنی حالت کا

جائزہ لے، اور سختی سے اپنا محاسبہ کرکے ان جرموں اور گناہوں کا پتہ لگائے جن کی پاداش میں ان کو یہ دن دیکھنے پڑے ہیں اور اس یقین وایمان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ جو مصیبتیں نازل کرتا ہے ان میں تنبیہ کا پہلو اور توبہ کا تقاضا ہوتا ہے۔ ان تمام برائیوں کو جو اس حالت کی ذمہ دار ہیں چھوڑے اور پھر صحیح عمل کے راستے پر گامزن ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو مسکنت اور ذلت سے نکال کر عزت کے اس مقام پر سرفراز کردے گا جو اس کی امیدوں سے بلند اور اس کے خوابوں سے روشن تر ہوگا۔ تباہی اور گمراہی کے دشتِ بے پایاں میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں سے صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ کر آنا ناممکن ہو۔ اس رجوع الی الحق کو توبہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے عزم واستقلال کی ضرورت ہے۔ طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے، کبھی یہ آزمائش خوف کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کبھی بھوک کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جان اور مال اور ثمرات کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ مؤمن ان امتحانوں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ مشکلوں میں ان کا ایمان اور زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ان کا عزم واستقلال اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے، اس کو صبر کہتے ہیں۔ صبر عزم الامور ہے بڑی ہمت کی بات ہے، تمام امور کی جان ہے۔ تمام امور میں فیصلہ کن عامل ہے۔ کامیابی کی ضمانت ہے جب کوئی مہم درپیش ہوتی ہے تو ایسے لوگ آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ اچھی طرح مشورہ کرکے ایک عزم کرتے ہیں۔ جب عزم کرلیا تو استقلال کے ساتھ سعی کرتے ہیں اور اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ اللہ کی توفیقات ان کے شاملِ حال ہوجاتی ہیں۔ اللہ کی رحمت ان پر نازل ہوتی ہے۔ خدا خود اُن کو بشارت دیتا ہے۔ یہی ایمان وعمل، عزم اور استقلال کا سیدھا صحیح راستہ ہے۔ جو منزل تک پہونچانے والا ہے۔

خوش خلقی

دین بندے کا اللہ سے لگاؤ ہے۔ اللہ سے لگاؤ کا لازمی نتیجہ انسان کا احترام ہے، احترامِ انسانیت کی ابتداء تہذیبِ نفس سے ہوتی ہے جیسا ایک فردِ خواہشات، اور غصہ حرص اور حسد کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو عدل کا پابند کرتا ہے اور احسان کی سعی کرتا ہے، چنانچہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی خواہشات کی پیروی نہ کریں، اور اپنے والدین کے ساتھ ہمسایوں اور قرابت داروں کے ساتھ اجنبیوں اور مسافروں کے ساتھ، غریب مسکین و غربا کے ساتھ احسان کریں۔ تہذیبِ نفس کا اظہار آدابِ معاشرت میں ہوتا ہے۔ ہماری خوش خلقی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے نفس کی کیسی تہذیب و ترتیب کی ہے۔ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی حرکات و سکنات میں، اپنے ملنے جلنے میں، لین دین میں اور بات کرنے میں، اپنے کھانے پینے، چلنے پھرنے، نشست و برخاست میں پہچانا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ خوش خلقی محض تکلف یا تصنع یا کوئی سطحی اور نمائشی چیز ہے۔ بلکہ خوش خلقی بلند اخلاق کا مظہر ہے، انسان کی خلقت یا بناؤ کا ایک حصہ ہے۔ خوش خلقی نیک عمل کا حسن ہے۔ کسی سے ہمدردی یا دلسوزی کا ایک لفظ کہنا اس سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ نیکی کر کے احسان جتایا جائے۔ خوش خلقی کی اہمیت کو ایک اور طریقہ سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایمان اور عمل کے ذریعہ معاشرہ میں وحدت پیدا ہوتی ہے لیکن انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ بہترین معاشرہ میں بھی آئے دن کی زندگی میں کچھ ناچاقیاں، آزردگیاں، شکوے، شکائتیں، کچھ تناؤ کھچاؤ، رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ خوش خلقی اور آدابِ معاشرت معاشرے کی مشین کے پرزوں میں تیل کا کام کرتے ہیں۔ جس میں معاشرہ خوش اسلوبی سے اپنے مقاصد پورا کرتا رہتا ہے۔

خوش خلقی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے متعلق نیک گمان رکھیں۔ مومن مرد اور عورتوں کی پہچان ہے کہ وہ آپس میں نیک گمان رکھتے ہیں۔ بعض بدگمانیاں گناہ کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کسی کی ٹوہ یا تجسس میں نہیں رہتے۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے

اور سازشیں کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ بدنامی اور برائی کی باتیں جب ایک منہ سے دوسرے منہ تک پہنچتی ہیں تو پھیلتی جاتی ہیں اور بڑھتی جاتی ہیں اور بے حیائی کے کاموں سے زیادہ بے حیائی کی باتوں اور قصوں کا معاشرہ میں پھیلنا اور لوگوں کا اس میں دلچسپی لینا معاشرہ کو مسموم کر دیتا ہے۔ اس لیے جب اس قسم کے فضیحتے ہم تک پہنچیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کو روک دیں اور صاف کہہ دیں کہ ہم تو سب کے لیے نیک گمان ہی رکھتے ہیں۔ اور ان باتوں کو تہمت اور بہتان سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق تہمت یا الزام لگانا تو بدخلقی ہی نہیں بلکہ گناہ اور جرم ہے۔ بدخلقی کا ایک کریہہ مظاہرہ دوسروں کی ہنسی اُڑانا، ان کو طعنے دینا، ان کے بُرے بُرے نام دھرنا ہے۔ قرآن شریف میں اس بات کو فسق کہا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ ۖ وَلَا نِسَاءٌ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔

"اے ایمان والو! کوئی لوگ دوسرے لوگوں سے ٹھٹھا نہ کریں شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو عیب نہ دیں اور بُرے بُرے نام نہ دو اور ایمان کے بعد فسق بڑا گناہ ہے۔ اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ظالم ہیں۔" جب آپس میں بات کرو تو قولِ سدید، درست و زنی بات کرو۔ ایسی بات مت کہو جو کرو نہیں، اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے، جب بات کہو تو انصاف کی بات کہو، بدعہدی مت کرو۔ جھوٹی بات مت کرو۔ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرتا ہے۔ قولِ زُور سے، لغو و اہیات مکر کی باتوں سے بچو۔ کسی کو ظاہر بظاہر بُرا مت کہو۔ اِلّا یہ کہ ظلم کیا گیا ہو، جھوٹے خداؤں اور بتوں کو بھی جنھیں کافر پکارتے ہیں بُرا مت کہو۔ اگر کوئی قوم کسی کو محترم رکھتی ہے تو تم اس قوم کے آدمیوں سے بات کرتے ہوئے اُس کو بُرا مت کہو ورنہ یہ لوگ بھی بغیر جانے ہوئے اللہ کو بُرا کہیں گے۔ ہر گروہ کو

اپنا اپنا عمل اچھا لگتا ہے۔ فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ لغو باتوں سے احتراز کرو۔ جب کسی سے لغو بات سنو تو کنارہ کش ہو جاؤ۔ یہ بات کہہ دو کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں۔ تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں۔ تم پر سلام ہو۔ ہم جاہلوں کی صحبت کے خواہاں نہیں ہیں۔ جب کسی بُری بات کو دیکھو تو باوقار طریقے سے گذر جاؤ۔ نیک نیتی کے باوجود سخت کلامی سے تنازعے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندے اچھی اور سچّی بات کہتے ہیں۔

"(اے رسولؐ) میرے بندوں سے کہہ دو کہ بات وہی کریں جو احسن ہو۔ شیطان ان میں فساد اور تنازعہ پیدا کرتا ہے بے شک شیطان انسان کا کُھلا ہوا دشمن ہے۔" (ترجمہ)

اگر کوئی سخت کلامی سے بات کرے تو بھی اچھے طریق سے اس کا جواب دو۔ اس طرح سے وہ لوگ بھی جو تمھارے دشمن ہیں دل سوز دوست بن جائیں گے۔ لیکن اس بات کی صلاحیت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ یہ بات صرف صبر و استقلال رکھنے والے بانصیب لوگ "ذو حظِ عظیم" ہی کر سکتے ہیں۔ چلنے پھرنے میں، بات چیت کرنے میں اپنے تمام طور طریق میں میانہ روی کی ہدایت کی گئی ہے۔ تمھاری وضع قطع ایسی نہ ہو جس میں تکبّر کا شائبہ پایا جائے۔

سورۂ لقمان میں حضرتِ لقمانؑ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے غرور سے اپنا منہ مت پھُلا اور اتراتا اکڑتا زمین پر مت چل۔ اللہ تعالیٰ اکڑنے والے، اترانے والے کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی چال ڈھال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو دھیما رکھ۔ بیشک آوازوں میں سب سے کریہہ آواز گدھے کی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

اترا کے اکڑ کے مت چل نہ تو اکڑ کر چلنے سے تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا۔ نہ تن کر چلنے سے لمبائی میں پہاڑوں کے برابر پہنچ سکے گا۔ غرض چلنے پھرنے میں یا بات کرنے میں جہاں بھی تکبّر کا شائبہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی بیزاری اور کراہت کا باعث ہے۔ آپس میں مِلنے جُلنے کے متعلق ہدایت ہے کہ جب کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کی اجازت لے کر داخل ہو اور اہلِ صاحب سلامت کرو۔ محفل میں کشادہ ہو کر نہ بیٹھو۔ جب محفل ختم ہو جائے تو اٹھ کھڑے ہو۔

لوگوں میں بیٹھ کر اپنی برتری مت کرتے پھرو۔ آئے دن کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنے پڑوسیوں سے سلوک کرتے رہو۔ جب کوئی شخص سلام کرے تو اس سے بہتر طریقے سے سلام کا جواب دو۔ گویا سلام کرنا سنّت ہے سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ زیادہ ثواب اس کو ہے جو سلام میں سبقت کرے۔ کوئی تم سے سوال کرے تو جھڑکو مت۔ اگر کوئی مدد نہیں کر سکتے تو نرم بات کہو۔ عفو و درگذر سے کام لو، فساد سے بچو، صلح اور اصلاح کی کوشش کرتے رہو۔ اَلصُّلْحُ خَیْرٌ۔

غرض خوش خلقی کی جو تصویر قرآنِ حکیم میں ابھرتی ہے وہ ایک باوقار اور سنجیدہ شخص کی ہے جو اپنے اصول و عمل میں مضبوطی سے جما ہوا ہے۔ لوگ اس پر اعتبار کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی بات کا پورا ہے۔ اس میں نہ تکبّر ہے نہ اوچھا پن۔ لغو اور فضول باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ سب سے نرمی اور شفقت سے پیش آتا۔ عفو و درگذر سے کام لیتا ہے۔ سب کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے، اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی یا اپنی فوقیت جتانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ اپنی تمام حرکات میں اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ رحمٰن کا بندہ ہے اور انسانیت کا بہت گہرا احترام اس کے دل میں ہے اور بدخلقی کی مکمل تصویر بھی قرآن شریف میں موجود ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے۔ ذلیل اوقات اور اوچھا ہے۔ طعنے دینے والا اور عیب جُو ہے۔ اِدھر اُدھر چغلی کھاتا پھرتا ہے۔ اس کی اُس سے لگائی، اس کی اس سے لگائی۔ کوئی اچھی بات ہے تو یہ بلاوجہ اس میں روڑے اٹکاتا ہے۔ حد سے بڑھنے والا ہے گنہگار ہے۔ بدذات اور بدنام ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۔ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۔ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۔ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۔

بُرائی کا مُقابلہ اچھائی سے

برائی انسانی نفس میں پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں پھیلتی ہے، اور پھر نفسِ انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے اس طرح یہ دائرۃ السوء پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کلامِ پاک میں برائی کے لیے بہت سے الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً ذنب، معصیت، جرم، ذم، بغی، فحش، طغیان، اثم، سئیہ۔ اور ہر لفظ میں برائی کی ایک مخصوص قسم یا نوع کی طرف اشارہ ہے لیکن ان میں ایک یہ پہلو ضرور موجود ہے کہ یا وہ ایسی بات ہے جو معاشرے کو اللہ کے راستے پر چلنے اور قائم رہنے میں رکاوٹ بنے یا ایسی بات ہے جو ایک فرد کی اللہ کے راستے پر چلنے کی اہلیت اور صلاحیت کو کم کر دے۔ دینِ اسلام کا منشا یہ ہے کہ فرد میں تقویٰ اور معاشرہ میں عدل و احسان ہو تاکہ افراد کی جدوجہد معاشرے کو بہتر بنانے میں مبذول ہو اور معاشرہ کا دباؤ افراد کی اصلاح و فلاح کی طرف مائل ہو۔ معاشرہ میں امن و سلامتی اور قلب میں اطمینان کے بھی معنی ہیں۔ ہم جنگ کی حالت میں نہ ہونے کو امن نہیں کہتے نہ مال کے ڈھیر کو فلاح کہتے ہیں بلکہ دنیا میں عدل کے قیام کو امن کہتے ہیں اور اخوت کے رواج کو فلاح کہتے ہیں تاکہ جماعت اور فرد کو ہر خوف سے آزادی ہو اور بھوک سے سیری نصیب ہو۔ خارجی یا داخلی فساد کو پسند نہیں کرتا، اور بے حیائی سے لگا کر ظلم تک فساد کی صورتیں ہیں۔ وہ خواہ اخلاقی بُرائی ہو یا قانونی جرم۔ سب قانون ہی اللہ کا ہے تو جرم اور گناہ میں برائی کے درجات میں فرق ہو لیکن نوعیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

برائی کو روکنا اور فساد کا انسداد معاشرہ کا اجتماعی و انفرادی فرض ہے۔ ہمیں یہ حکم ہے کہ اگر برائی کو دیکھو تو اس کو طاقت سے روکو۔ اگر طاقت میسر نہ ہو تو زبان سے منع کرو۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہیں تو دل میں ضرور برائی کو برائی سمجھو۔ یہ ایمان کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر کسی معاشرہ میں برائی اور اچھائی کی تمیز نہ رہے تو پھر اس معاشرہ سے عذابِ الٰہی بہت دُور نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں اس حد تک احتیاط لازم ہے کہ کچھ اچھائیاں واضح طور پر

ہیں۔ کچھ برائیاں واضح طور پر برائیاں ہیں۔ لیکن کچھ وہ عمل جن میں اشتباہ ہو کہ یہ برائیاں ہیں یا اچھائیاں ہیں تو ان کے متعلق بھی تقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔

برائی اور اچھائی کا عمل بظاہر ایک ہی جیسا ہو سکتا ہے۔ دو گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ دونوں طرف سے تشدد اور خونریزی ہو رہی ہے۔ اب اگر دونوں گروہوں کی نیت اور مقاصد ایک ہی جیسے ہوں۔ دونوں ایک ہی قسم کے اقتدار کی ہوس میں نبرد آزما ہیں تو دونوں فریق برائی پر ہیں، اور اللہ کی زمین پر فساد برپا کر رہے ہیں۔ یہ دو برائیاں مل کر ایک اچھائی نہیں بنتی۔ ایک فریق کے فتح مند ہونے کی صورت میں بھی فساد ختم نہیں ہوتا بلکہ محض فتنہ و فساد کی صورت بدل جاتی ہے۔ بسا اوقات دونوں متحارب گروہ آپس میں لڑ کر تباہ ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایک نیا نظام قائم کر دیتا ہے اور انسانوں کی مذموم تدابیر کا فیصلہ تقدیرِ الٰہی کے ہاتھوں ہو جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں لوگوں کے مکر اور اللہ کے مکر کے یہی معنی ہیں۔

لیکن اگر ایک گروہ دنیا میں عدل و احسان پھیلانا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اس راستہ میں رکاوٹ ڈالنا چاہتا ہے اور ظلم کی حمایت کرتا ہے اور دونوں میں آپس میں جنگ ہوتی ہے تو گو دونوں گروہوں کا عمل بظاہر ایک جیسا نظر آتا ہے لیکن ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برائی کا فریق بظاہر فتح پا کر بھی بالآخر ناکام ہوتا ہے۔ اچھائی کا فریق بظاہر شکست پا کر بھی صبر و استقلال اور صلوٰۃ کے ساتھ بالآخر کامیاب ہوتا ہے۔ یہ جہاد کا فلسفہ ہے یہ رحمت ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ میں جہاد کا نبی ہوں۔ میں رحمت کا نبی ہوں۔

اسی طرح جس جرم کا قصاص لیا جا رہا ہے اور جس عمل کے ذریعہ قصاص لیا جا رہا ہے وہ بظاہر ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن پہلا عمل معاشرے میں فساد پیدا کرتا ہے اور بُرا ہے، اور دوسرا عمل اس فساد کو دُور کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اور اچھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ حضورؐ مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے باز رکھا جائے، حالانکہ عہدِ جاہلیت میں یہی مثل عصبیت کی حمایت میں استعمال

کی جاتی تھی۔ ہمیں یہ تعلیم نہیں دی گئی ہے کہ ہر "تشدد" اور طاقت کا استعمال بُرا ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ طاقت
کے صحیح حصول کا ذریعہ اور صحیح مصرف اچھائی ہے، اور اچھائی کو اپنی تمام صلاحیتوں، اور توانائیوں کے ساتھ اپنے اندر پیدا کیا جائے اور دنیا میں پھیلایا جائے۔ کمزور اور مریض اور بیجان اچھائی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اچھائی کو توانا ہونا چاہیئے، اور صبر و استقلال و صلوٰۃ اچھائی میں توانائی پیدا کرتی ہیں۔

برائی کے مقابلہ کا منفی طریقہ تو یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے اور مثبت طریقہ یہ ہے کہ اس کی جگہ اچھائی پیدا کی جائے، اور بُرائی کے مقابلہ کیلئے اسی طریق کار پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہمارا معاملہ لا الٰہ پر ختم نہیں ہوتا بلکہ الا اللہ تک پہنچتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ لا الٰہ اور الا اللہ کو عملی صورت میں ڈھالنے کے لیے محمدؐ رسول اللہ بھی ہمارے عقیدہ اور عمل کا جزو ہے۔ گویا برائی کا مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بُرائی کو چھوڑ کر اچھائی کو اختیار کیا جائے، اور اچھائی کو اختیار کرنے کے عملی تقاضے پورے کیے جائیں۔ توبہ کی مصلحت یہی ہے۔ اگر توبہ کا راستہ نہ ہوتا تو انسان اپنی برائیوں کی پاداش سے نہیں بچ سکتا تھا۔ "برائیوں کی سزا ملتی ہے سوائے اس کے کہ جس نے توبہ کی اور ایمان قبول کیا اور صالح عمل کیے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی برائی کو اچھائی سے بدل دیتا ہے اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔" یہ الٰہی قانون بڑے گناہوں سے لگا کر بُری عادتوں تک ہر برائی کا مقابلہ کرنے میں کارفرما ہے۔ ایک بُری عادت کو دُور کرنے کا مثبت طریقہ یہ ہے کہ اس کی جگہ اچھی عادتیں پیدا کی جائیں تاکہ زندگی کے اس منطقہ میں شعور و احساس کی سطح ہی بدل جائے۔ اس قانون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان کیا ہے۔ بے شک اچھائیاں، برائیاں حسنات سیئات کو دور کر دیتی ہیں، اور اس عظیم قانون پر غور کرنے کی ہمیں دعوت دی گئی ہے کہ اس میں نصیحت و عبرت ہے۔

معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی بھی صورت یہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں اچھائیوں کو عملاً پھیلایا جائے بلکہ برائیاں جس طریق فکر و عمل کا نتیجہ ہیں اس کی جگہ وہ طریق فکر و عمل رائج کیا جائے جس سے اچھائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محض ان برائیوں کا چرچا

کرنے سے وہ برائیاں اور بھی پھیلتی ہیں۔ اگر معاشرہ میں رشوت عام ہو گئی ہے تو اس کو دفع کرنے کا حل یہ نہیں ہے کہ ہر شخص ہر وقت اس کا رونا روتا رہے۔ یہ بات یہ رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو خود اس بُرائی میں ملوّث ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کا شبہ ان پر سے دُور ہو جائے۔ ہمارے معاشرہ میں ہر شخص رشوت کی برائی کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ جب ہر شخص رشوت کی برائی کرتا ہے تو رشوت لیتا کون ہے۔ معاشرے میں جو بے حیائی کی بات ہو تو وہ جب تک پہنچے تو اس کو وہیں روک دو، اس کو مزے لے لے کر اور دل کی تمنّائیں زبان سے پوری کر کے اور بظاہر ان پر اظہارِ ناراضگی کر کے دوسروں تک مت پھیلاؤ۔ اپنی نیکی کا پیٹ برائیوں سے مت بھرو۔ کوئی شخص تم سے فریب اور چالاکی سے پیش آتا ہے تو تم اس ترکیب سے کام مت لو۔ مکاری کا جواب راست روی ہے۔ ہر برائی کا دفعیہ اس برائی کی سطح سے نہیں ہوتا بلکہ اس سے اونچی سطح سے ہوتا ہے۔ اگر تم لغو اور بیہودگیوں کے پاس سے گزرو تو بُردباری کے ساتھ گذر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تم ہانک پکار کر ایک دوسرے کو بُرا کہتے رہو۔ اور اسی میں اپنی نیکی سمجھو۔ ہاں ظلم کے خلاف فریاد کرنا اور بات ہے، کوئی شخص اگر تم سے دشمنی کرتا ہے اور تم بھی اس سے دشمنی کرتے ہو تو دونوں طرف تنگ دلی اور انتقام کا جذبہ برابر ہے کہ ایک طرف کی برائی دوسری طرف کی برائی کو شہ دیتی ہے، ہاں اگر تم فراخدلی سے کام لو اور اس کے ساتھ نیکی اور اچھائی سے پیش آؤ تو برائی کا پھیلنا ہی نہیں رُکے گا بلکہ وہ اچھائی سے بدل جائے گی۔ ہمیں نصیحت کی گئی ہے کہ بھلائی اور برائی کبھی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کو اچھائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمھارا دلسوز دوست ہے۔ یہ ضروری بات ہے کہ یہ اچھائی مکاری کے طور پر نہ دکھائی جا رہی ہو بلکہ یہ اچھائی تم اس لیے کر رہے ہو کہ تمھیں اپنے جذبات پر قابو ہے اور تم کو قدرت نے انسانیت کا بڑا حصہ دیا ہے۔ برائی وبا کی طرح پھیلتی ہے تو اچھائی چراغ کی روشنی کی طرح۔ لوگ نیکی کو کمزور سمجھتے ہیں لیکن اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے بلکہ طاقت نیکی ہی میں ہوتی ہے۔ دنیا میں وہی چیز قائم رہتی ہے جس میں اللہ کے بندوں کے لیے منفعت ہو۔

اخوّت

اخوّت کے لغوی معنی برادری یا بھائی ہونا ہے۔ اخوّت ایک فطری رشتہ سے قائم ہوتی ہے اور اسلام نے حسنِ سلوک اور وراثت وغیرہ کے معاملہ میں اس رشتہ کا حق پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ جہاں ہمیں ایک طرف اپنے اقربا کا خاص طور پر خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ وہاں دوسری طرف اس حق کے حدود یہ ہیں کہ رشتے ناطے کی محبت ہمیں سچی گواہی دینے اور انصاف کرنے سے باز نہ رکھے نہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت میں مانع ہو۔ اگر ہمارے بھائی ہمیں اللہ اور رسولؐ سے اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر اللہ اور رسولؐ کو ہماری کوئی ضرورت نہیں اور اگر ہمارے بھائی دینِ حق کے مخالف ہوں تو پھر ان سے کسی طرح ساز باز یا رفاقت رکھنا ظلم ہے۔ اسی فطری رشتہ کے معنی کو وسعت دے کر ہم قوم یا ہم قبیلہ افراد کو بھی بھائی کہا گیا ہے۔ خواہ ان کی قوم کی طرف سے ان کے لیے شدید مخالفت یا مخاصمت ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرے اہم تر معنی اخوّت کے اخوّت فی الدین ہیں۔ دین کی اصل توحید ہے۔ تمام عالمین کا خالق اور رب ایک ہی ہے۔ تمام خلق اسی کا کنبہ یا عیال ہے۔ انسان کا انسان سے رشتہ بلا لحاظ رنگ و نسل یا عقیدہ و مذہب ایک خدا کا بندہ ہونے کی بنیاد پر استوار ہے۔ اور انسانی کنبہ کے وہ لوگ جو اللہ کی عبادت میں ہمارے رفیق اور شریک ہیں بلا امتیاز رنگ و نسل دین میں ہمارے بھائی ہیں۔ اس اخوّت کی بنیاد یہ ہے کہ ہم ایک ہی آقا کے فرمانبردار اور غلام ہیں۔ ایک ہی مقصد کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کو یاد دلاتا ہے کہ مسلمان ہونے سے پہلے عرب آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے ان کے دلوں میں محبت ڈال دی۔ اس کی نعمت سے وہ بھائی بھائی ہو گئے، حالانکہ وہ تو بالکل آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اس طرح اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے یہ نشانی روشن کر دی۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے ارشاد فرماتا ہے کہ اگر تم دنیا کے خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی

دلوں میں یہ محبت پیدا نہ ہوتی، یہ تو اللہ تعالیٰ نے دلوں میں محبّت پیدا کر دی ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ گویا وہ محبّت کا رشتہ جو اخوّت و اتحادِ اسلامی کی بنیاد ہے کسی لالچ یا خوف سے پیدا نہیں ہوتا۔ لالچ کی وجہ سے تو بھیڑیوں کا ایک گروہ بھی آپس میں ایک ہو جاتا ہے۔ اور خوف کی وجہ سے بھیڑوں کا گلّہ بھی مل بیٹھتا ہے۔ اخوتِ اسلامی کا محرّک اس جذبہ اور ارادہ اور عمل میں اشتراک ہے کہ دنیا میں اقامِ صلوٰۃ کر کے اللہ کی حاکمیت اور بندوں کی آزادی اور برادری کو قائم کیا جائے۔ ایتائے زکوٰۃ کر کے لوگوں میں عدل اور احسان کو پھیلایا جائے۔ امر بالمعروف کر کے اچھی باتوں کو رواج دیا جائے اور نہی عن المنکر کر کے بُری باتوں کا قلع قمع کیا جائے۔

عدل اور احسان کے بغیر اسلامی اخوّت کا تصوّر ہی ناممکن ہے۔ عدل کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر شئے کو اپنی جگہ پر رکھا جائے۔ حقوق العباد کو پوری طرح ادا کیا جائے۔ اسلام نے ہر انسانی تعلق کے حقوق اور فرائض مقرر کر دیئے ہیں۔ حدود اللہ کو قائم کر دیا ہے۔ اعتقادات اور عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات اور اخلاق کے تمام پہلو واضح کر دیئے ہیں۔ روزی کمانے میں جس کو فضلِ الٰہی کی تلاش کہا گیا ہے حلال و حرام کا فرق بتا دیا ہے۔ بے سہاروں کی خبر گیری اور مساکین کے پیٹ بھرنے کی تدابیر کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ ذاتی آمدنی میں سائلین، اور محرومین کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے فرائض کو پورا کرنا عدل ہے جو عدل نہیں کرتا وہ قرآنی اصطلاح میں ظالم ہے۔ ظالم اور مظلوم بھائی بھائی نہیں ہوا کرتے اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرے اور مظلوم کو فریاد کرنے سے اس عذر پر روکے کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں تو یہ ظلم بالائے ظلم ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ لوگو! اگر کوئی تمہارا بھائی ظالم ہو تو اس کی بھی مدد کرو اور مظلوم ہو تو اس کی بھی مدد کرو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آگیا کہ اس کی دادرسی میں اعانت کی جائے۔ لیکن ظالم کی مدد کرنے کا کیا مطلب ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی ظالم کی مدد اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھا جائے۔ انھیں فرائض کو انفرادی اور اجتماعی طور پر خوش دلی سے پورا کرنا اللہ کے فضل کے ساتھ ساتھ اللہ کے رضا اور رضوان کی بھی تمنّا کرنا ہے۔ یہی احسان ہے۔

بغیر عدل کے احسان نہیں، احسان اخوت کا مقام ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بھائی کا ذمہ دار ہے۔ اگر پورے معاشرے میں کوئی شخص بھوکا سوجاتا ہے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں پاتا یا وہ مظلوم ہے اور اس کی دادرسی کی کوئی سبیل نہیں تو تمام معاشرہ اس کے لیے جواب دہ ہے اور اس معاشرہ میں اخوت کی کمی ہے۔

حضورؐ جب مکّہ سے مدینہ تشریف لائے تو نسب اور مقام کے اعتبار سے مہاجر اور انصار دو مختلف گروہ تھے۔ ان دو گروہوں کو ایک ملّت بنانے کے لیے اور اخوتِ اسلامی کو فروغ دینے کے لیے آپ نے مہاجرین اور انصار میں رشتۂ مواخات قائم کر دیا، اخوّت کے ذریعہ سے وہ لوگ جو نسل اور وطن کے لحاظ سے غیر ہوتے ہیں مل کر ایک ملّت بن جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ نسل کے اعتبار سے غیر ہیں اور تمھیں ان کے باپ دادا کا علم نہیں وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں اور موالی ہیں۔ گویا وہ بھی تمھارے خاندان کے ہی افراد ہیں اور اس حیثیت سے تم ان کے ذمہ دار ہو۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ حکم ہے کہ اگر تم میں کوئی اختلافات ہوں تو مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے بھائیوں میں صلح کرا دو۔ اللہ سے ڈرتے رہو، اگر اللہ سے ڈرتے رہو گے اور واقعی اصلاح کی کوشش کرو گے تو اللہ تمھارے اوپر رحم کرے گا اور تمھارے اختلافات کو دور کر دے گا۔ اس بات کو سختی سے منع کیا گیا ہے کہ باہمی اختلافات کی وجہ سے تم ان لوگوں کو جو تمھاری ملّت کے دشمن ہیں اپنا دوست اور مددگار بنانے لگو۔ اس سودے میں کھلا ہوا نقصان ہے۔

گویا جس طرح دوسری ملتوں میں رابطۂ اتحاد ایک عصبیت ہے جو نسل اور وطن پر مبنی ہوتا ہے ہماری ملّت میں رابطۂ اتحاد اخوّتِ اسلامی ہے۔ اخوّتِ اسلامی کی بنیاد توحید و رسالت کا عقیدہ ہے، عدل و احسان سے اس کا قیام و استقلال ہے، اخوتِ اسلامی کا تقاضہ یہ ہے کہ معاشرے کو ہر قسم کے ظلم سے پاک رکھا جائے اور معاشی ناہمواریوں کو کم از کم اس حد تک دور کیا جائے کہ ہر فرد اپنے آپ کو معاشرے کا فعال، باوقار اور ذمہ دار جزو سمجھ سکے۔

جب اس اخوت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو یہ رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب یہ رابطہ کمزور ہو جاتا ہے تو ملت میں انواع و اقسام کے فساد اور انتشار رونما ہونے لگتے ہیں۔

رائے کا وہ اختلاف جو رحمت ہے

اسلام دینِ فطرت ہے، اللہ کی قائم کی ہوئی فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انسانی فطرت کی اساس مشترک ہے۔ اس میں سچائی کی تلاش اور نیکی کی تڑپ ودیعت کی گئی ہے جو مسخ ہو سکتی ہے، بھلائی جا سکتی ہے، دبائی جا سکتی ہے لیکن مٹائی نہیں جا سکتی۔ ایک طرف انسانی فطرت کی یہ اساس مشترک ہے اور دوسری طرف معاشرتوں اور طبیعتوں کا اختلاف بھی فطری ہے۔ ہر زمانے کا ماحول اور زمانے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور انسانی گروہوں اور افراد کے ردِّ عمل بھی مختلف ہوتے ہیں۔

اسی لحاظ سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ دین ایک ہے، مذاہب مختلف ہیں، دین ایمان اور عملِ صالح ہے۔ یہ میثاقِ ازل ہے جو بندے اور اس کے اللہ کے درمیان استوار ہے۔ مذہب میں شرع اور منہاج اور مناسک شامل ہیں جو مختلف ہیں۔

قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ ہر امت کے لیے عبادت کا ایک خاص طریقہ ہے جس پر وہ امت چلتی ہے۔ ہر گروہ کے لیے کوئی نہ کوئی سمت مقرر کی گئی ہے لیکن "الامر" میں تنازعہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نیکی میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ گویا حقیقت ایک ہے، شریعت اور طریقت مختلف ہیں۔

عین حکمتِ الٰہی ہے کہ اس نے مختلف زمانوں میں اور مختلف امتوں میں اپنے نبی اور رسول بھیجے۔ یہ بھی فطرتِ انسانی کا کرشمہ ہے کہ ایک ہی زمانے اور طبیعتوں کے لحاظ سے فکر و عمل کے مختلف مکاتیب پیدا ہوئے۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے۔

اس امرِ واقع کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم میں فرقہ بازی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ دین میں تفرقہ مت کرو۔ اللہ کی رسی کو مل کر مضبوط پکڑو، الامر کے اندر تنازعہ مت مت کرو، علم اور روشن دلیلیں آنے کے بعد لوگ طبعی بغاوت اور انسانی خواہشوں کی وجہ سے دین میں اختلافات اور تفرقے پیدا کر دیتے ہیں اور فرقہ بازی شرک کی عملی صورت ہے۔

فرقہ بازی اس حالت کو کہتے ہیں کہ مذہب کو یا شرع اور منہاج اور مناسک کو اصلِ دین کا قائم مقام اور بدل سمجھ لیا جائے۔ ایک فروعی جز کو بغیر کسی سند کے کل کا مرتبہ دے دیا جائے۔ حق سے تعلق کی بجائے ایک جماعتی عصبیت پیدا کر لی جائے۔ خدا پرستی کی جگہ گروہ پرستی لے لے۔ ایمان اور عملِ صالح کی بجائے نجات کا معیار ایک خاص فرقہ میں شمولیت کو مقرر کر لیا جائے۔ فرقہ بازی کسی ایک مذہب یا مسلک کے پابند ہونے کو نہیں کہتے۔ کسی مسلک کا پابند ہونا تو اچھی بات ہے بلکہ ضروری بات ہے۔ فرقہ بازی ایک ذہنیت ہے جس کی نشان دہی قرآنِ حکیم میں یہود و نصاریٰ کی مثال دے کر کی گئی ہے۔ یہود یہ کہتے ہیں، نصاریٰ کا دین کچھ نہیں، نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ یہود کا دین کچھ نہیں، اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہودی یا نصرانی گروہ میں شامل نہ ہو، اور یہود کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں۔ ہمیں تو جہنم کی آگ چھوئے گی بھی نہیں مگر چند دنوں کے لیے سب یہ بھول جاتے ہیں کہ جس نے برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا اس کے لیے دوزخ ہے۔ اور جس نے ایمان کی راہ اختیار کی اور عملِ صالح کیا وہ جنتی ہے۔ یہ ذہنیت فرقہ بازی کی ہے، وہ عیسائیوں میں ہو یا یہودیوں میں ہو یا شیعوں میں ہو یا سنیوں میں ہو، اس فرقہ بازی کی ذہنیت کی وجہ سے مذاہب کی تاریخ نفرت اور انسانی خونریزیوں سے آلودہ ہو گئی۔

دینِ اسلام میں انسان کی فکر پر پہرے نہیں بٹھائے گئے بلکہ بار بار غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ تفکر و تعقل کو انسان کا بحیثیت انسان فریضہ قرار دیا ہے۔ جبر و اکراہ کو دین کی مقبولیت کے منافی بتایا ہے۔ دین کو اختیار کرنے کا طریقہ علیٰ وجہ بصیرت مقرر کیا ہے۔ حضورؐ کا ہر قول و فعل براہِ راست اللہ کی ہدایت سے منور تھا لیکن آپ سے کہا گیا ہے کہ اہم معاملات میں مشورہ کر لیا کرو اس لیے کہ مشاورت میں بہت سے اجتماعی مفادات مضمر ہیں اور وہ اجتماعی کردار کی تربیت کا ایک اہم حصہ ہے، مشاورت کو مومنین کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف رائے کی آزادی سے سوچنے اور غور کرنے کی عادت استوار ہوتی ہے اور یہ انسان کے لیے ذہنی ریاض اور تربیت ہے اور اس تجویز اور عمل میں مشارکت کا احساس قوی ہوتا ہے، وہاں رائے کی آزادی کے نتیجہ کے طور پر اختلاف کا ہونا بھی

رائے دینے کی ذمہ داری کو پورا کرو۔ محض تخمین وظن، علم ویقین کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ رائے محض ہوا و ہوس کی آواز اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ ہو۔ یہی طبیعت کی بغاوت ہے، مفادات کا تصادم ہے۔ یہی خود غرضیاں اور نفس پرستیاں ہیں جو آزادیِ رائے کے بھیس میں اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرتی ہیں۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ رائے کسی عصبیت کی صدائے بازگشت نہ ہو۔ کہیں تم اسی کو تو اپنی رائے نہیں سمجھ رہے ہو جو اپنے باپ دادا سے سنتے آئے ہو، جسے تم عقیدہ سمجھ رہے ہو وہ تمھارے طبقہ یا فرقہ کا نعرہ تو نہیں ہے۔

اسی بات کو مثبت طریقے سے اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ رائے کے وقیع و معتبر ہونے کے لیے تین شرائط ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ رائے کا جس علم سے تعلق ہے رائے دینے والا اس علم میں راسخ ہو۔ اگر وہ سیاست میں رائے دے رہا ہے تو وہ اقوامِ عالم کی تاریخ اور اُن کے عروج و زوال کے اسباب و علل سے اور مفکرین نے اس معاملہ میں جو کچھ سوچا ہے اور زمانے نے جو کچھ ثابت کیا ہے اس سے نابلد نہ ہو۔ اگر وہ مذہب کے کسی معاملہ میں رائے دے رہا ہے تو کتاب و سنت کا علم ہو۔ فروعی جز کو اس کے اصل تک پہنچانے کی صلاحیت ہو جس کو تاویل کہتے ہیں۔ اہلِ علم نے جو کچھ سوچا ہے اور کہا ہے اس کا علم ہو، اور بڑی بات یہ ہے کہ جو رائے دے رہا ہے وہ محض ایک ذہنی آزمائش کا کھیل نہ ہو بلکہ اس میں کچھ یقین و تجربہ بھی شامل ہو اور اس میں جہالت کی انانیت کی بجائے علم کا صحیح انکسار ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ رائے دینے والا صاحبِ تقویٰ ہو، خواہ سیاست کا معاملہ ہو یا دین کا اس کی نظر فساد کی طرف نہ ہو۔ اس رائے میں ذاتی یا جزوی مفاد کی آمیزش نہ ہو۔ اسکا مقصد مفادِ عامہ یا اظہارِ حقیقت کے علاوہ کچھ نہ ہو، نہ رائے پر داخلی و خارجی خوف اور دباؤ اور ترغیبات کا اثر ہو، نہ اس کا مقصد اپنے گروہ کی طاقت بڑھانا ہو۔

اور تیسری شرط یہ ہے کہ رائے دینے والے میں عدالت کا ملکہ ہو۔ ایسی صورتِ حالات کا صحیح علم ہو اور جو رائے دے رہا ہے اس کے تمام دور رس نتائج و عواقب پر اس کی نظر محیط

ناگزیر ہے، اور یہ اختلاف جہاں اپنے حدود میں رحمت و برکت کا باعث ہے وہاں اپنے حدود سے تجاوز کر کے بے راہ روی اور جماعتی افتراق و انتشار بھی پیدا کرتا ہے، اکثر برائیاں کسی بالاصل اچھائی کی اپنی حد سے بڑھی ہوئی صورت ہی ہوتی ہیں۔ اگر رائے کی آزادی نہ ہو تو انسان انسان نہیں رہتا۔ اگر رائے کی بلا شرط آزادی ہو تو جماعت میں انتشار کا خطرہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خطرہ تو ہر نیکی میں ہے اور جس نیکی میں خطرہ نہیں وہ بے جان ہے۔

اسلام میں ایک طرف رائے کی آزادی دی گئی ہے تو دوسری طرف سوچنے سمجھنے کی تربیت بھی اسلامی زندگی کے ریاض کا ایک لازمی جزو ہے۔ حقیقت میں آزادی اور تربیت ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ تربیت کے بغیر آزادی انتشار ہی نہیں ہے بلکہ ناممکن ہے۔ جس چیز کو ہم ذاتی رائے کہتے ہیں اگر تجزیہ کیا جائے تو اکثر پندار اور خود فریبی اور جہل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بول رہے ہیں لیکن ہماری آواز میں معلوم نہیں کہ قبیلوں کے اور غاروں کے اور بازاروں کے اور کھیل تماشوں کے کون کون سے بت بولتے ہیں۔ کتنے کم لوگ ہیں جو ذاتی رائے یا آزادانہ رائے کی صلاحیت کی منزل تک پہنچنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ وہ بھی کس قدر خود نگری اور ریاض کے بعد۔ دوسری طرف ذہنی تربیت کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ کسی ایک عقیدہ کو ذہن پر مسلط کر کے اس سے سوچنے کی طاقت ہی سلب کر لی جائے اور اچھا خاصہ انسان سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ..... کہنے ہی نہیں لگے بلکہ سمجھنے بھی لگے۔ جب ہم انسانی ذہن کی اثر پذیری کی قریب قریب لامحدود صلاحیت پر اور انسانی ذہن کی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لیے حیرتناک اختراعات پر نظر کرتے ہیں تو ظالموں کے خلاف سوا خدا کی پناہ تلاش کرنے کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

عقل و رائے کی تربیت کے تین موٹے موٹے اصول بتائے گئے ہیں (۱) رائے ناقص علم پر مبنی نہ ہو۔ اسلام علم ہے۔ تاکید کی گئی ہے کہ جن چیزوں کا تمھیں علم نہیں ہے اٹکل پچو ان کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔ تہدید کی گئی ہے کہ تمھارے کان اور آنکھ اور قلب جو حصولِ علم کے ذرائع ..... ہیں اور ذمہ دار ہیں۔ رائے دینے سے پہلے علم حاصل کر کے

ہو۔ زندگی کا ایک پہلو دوسرے پہلو سے مربوط ہوتا ہے۔ ایک شعبے میں اقدام کا اثر تمام دوسرے شعبوں تک پہنچتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ رائے پر عمل کرنے سے ایک سامنے نظر آنے والا مقصد تو حاصل ہو جائے اور اس سے بڑا کوئی نگاہوں سے اوجھل مقصد فوت ہو جائے۔ اور زندگی کا توازن بگڑ جائے، کیونکہ جیسا آج کل زمانے کے حالات سے نظر آتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں عدمِ توازن سے امن و اطمینان ختم ہوتا ہے اور خوف اور بے چینی پھیلتی ہے۔

ان ہی علم اور تقویٰ اور عدالت کے اوصاف سے رائے میں وزن اور اعتبار پیدا ہوتا ہے، اور آزادیِ رائے کا حق پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگر اختلافِ آرا ہے تو وہ رحمت ہے اس لیے کہ اس اختلاف سے حقیقت کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ عمل کی نئی راہیں کھلتی ہیں، اتحاد میں ایک معنی پیدا ہوتے ہیں۔ فرد میں خود اعتمادی بڑھتی ہے اور فکر و عمل کے لیے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ جمود کی بجائے حرکت اور حرکت میں برکت پیدا ہوتی ہے۔

فقر کا قرآنی تصوّر

امام راغب صاحبِ مفردات کے نزدیک فقر اس کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ اصطلاحاً اس لفظ میں انکسار، عجز، افلاس، احتیاج کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ کلامِ پاک میں فقراء مخصوص طور پر ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو نیک ہیں اللہ کی راہ پر چلتے ہیں بلکہ اس کے لیے وقف ہو چکے ہیں، معیشت کے راستے ان پر تنگ ہو گئے ہیں، اپنے آپ کو محصور و مجبور پاتے ہیں، خودداری اور سیر چشمی کی پھر بھی یہ کیفیت ہے کہ ظاہر میں لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ان کو کسی بات کی احتیاج نہیں۔ غور کرنے سے ان کی پیشانیوں سے ان کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے املاک و اموال سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے فضل و رضوان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اجتماعی و انفرادی زندگی کے نیک مقاصد کو آگے بڑھانے میں مستقل سعی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی خبر گیری معاشرے کا اوّلین فرض ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا حق صدقات اور خیرات میں ہے، صدقات و خیرات کو نمود و نمائش اور احسان جتانے کا ذرا بھی شائبہ باطل کر دیتا ہے۔ ان کا محرّک محض احساسِ فرض اور اللہ کی خوشنودی کی طلب ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو قرض دینا ہے، اور اللہ سے بڑھ کر قرض کا بدلہ دینے والا کون ہے۔ اس "انفاق فی سبیل اللہ" میں اجتماعی و انفرادی فلاح کا راز مضمر ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک خوش حال نہیں سمجھا جا سکتا، نہ اس کی ظاہری خوش حالی مستقل ہوتی ہے، نہ وہ زندگی کے بلند مقاصد میں ترقی کر سکتا ہے جب تک اس میں ایک طبقہ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس درجہ قاصر ہو کہ وہ نیکی کرنے کی بھی استطاعت نہ رکھے، دوسروں کی مدد نہ کرنا خود اپنی مدد کرنا ہے بلکہ اپنی مدد کرنے کی بامعنی صورت ہی یہ ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک باغ لگانا جس کی سرسبزی اور شادابی کے لیے خود اللہ کی رحمت کی بارشیں

ضامن ہیں، حضورؐ نے فرمایا ہے کہ صدقات دنیا اور عزیزوں سے حسنِ سلوک کرنا ملکوں کو آباد کرتا ہے اور عمروں میں ترقی دینے کا باعث ہے۔

جو لوگ محض تفاخر و نمائش کے لیے یا دکھاوے کی نیکی کمانے کے لیے اللہ کا دیا ہوا مال خرچ کرتے ہیں ان کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ شیطان ایک طرف تو لوگوں کو تبذیر یعنی فضول خرچی پر اُکساتا ہے اور دوسری طرف راہِ خدا میں مال کے انفاق و ایثار سے روکنے کے لیے لوگوں کو فقر سے ڈراتا ہے، ان میں بخل پیدا کرتا ہے، ان کے دل میں تنگی پیدا کرتا ہے اور مال و زر کی حُبّ و ہوس کو سینہ میں مشتعل کرتا ہے، مال و زر کی ہوس فقر النفس یعنی روح کا افلاس ہے۔ یہ مرض مالدار اور غریب دونوں کو لاحق ہو سکتا ہے۔ ایک طرف مالدار کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ باوجود مال و زر کی فراوانی کے ہوس یا فقر النفس اس کو مفلس اور فقیر ہی رکھتی ہے، اور دوسری طرف انسانیت کی سب سے افسوسناک صورت اس مفلس کی ہے جس کے پاس مال و زر بھی نہیں اور وہ ہوس اور حسد کی آگ میں جلتا رہے۔ فقر کی یہی مذموم صورت ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ وہ کفر سے بہت نزدیک ہے۔ مدینہ کے وہ یہود جو مال و زر کے پرستار تھے اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی مقابلتہً افلاس کی حالت دیکھتے تھے اور یہ سنتے تھے کہ مسلمانوں کا خدا اپنے بندوں سے قرضِ حسن طلب کرتا ہے تو وہ طعنہ زن ہوتے تھے کہ اگر مسلمانوں کا خدا غنی ہوتا تو وہ اپنے ماننے والوں کو مالدار کیوں نہ بنا دیتا اور ان سے قرض کیوں مانگتا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ تاریخ نے مسلمانوں کے خدا کی طاقت بھی دیکھ لی اور یہودیوں کے سونے کے بچھڑے کا عجز بھی دیکھ لیا۔

فقراء سے متعلق معاشرہ یا جماعت کی ذمہ داریوں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ کلامِ پاک میں اس بنیادی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ انسان بحیثیت انسان محتاج اور فقیر ہے اور غنی ذات محض اللہ تعالیٰ کی ہے۔ "اے لوگو! تم اللہ کی طرف فقیر ہو اور اللہ ہی غنی اور قابلِ حمد ہے"۔ اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے نفس پر ہی بخل کرتا ہے، اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو"۔ کوئی انسان احتیاج سے خالی نہیں ہو سکتا، تو پھر ایک محتاج کا دوسرے محتاج کو

قاضی الحاجات سمجھنا شرک نہیں تو اور کیا ہے ؟ جب انسان فطرتاً فقیر ہے تو فقیر کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ وہ اسباب کی سعی خدا کے فضل کی تلاش سمجھ کر ضرور کرے لیکن مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے ، یہ عزتِ نفس اور خودداری کا پہلا سبق ہے ، عبدیت کی تعمیر اسی بنیاد پر ہوتی ہے اور اسی منزل پر فقر اور عبدیت ہم معنی ہیں ۔

اس زبردست حقیقت کو عملاً تسلیم کرنے سے انسان ہر لالچ اور خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ ناداری اس کی جمعیتِ خاطر کو پریشان نہیں کرتی اور اس کو مایوسی کے حوالے نہیں کرتی ، اور دولت و ثروت اس کو اپنا غلام نہیں بناتی اور مغرور نہیں کرتی ۔ اس میں قناعت کی اعلیٰ صفت پیدا ہو جاتی ہے ۔ قناعت کو غلط طور پر سعی اور جدوجہد کے منافی سمجھا جاتا ہے ' اور کچھ لوگ تو اقوامِ شرق کے تنزل اور پسماندگی کا باعث ہی قناعت کو ٹھہراتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ قناعت ہی انسان کی سعی و جدوجہد کو صحیح سمت عطا کرتی ہے اور اس میں معنی پیدا کرتی ہے ۔ قناعت زندگی کی طرف ایک مخصوص رویّہ کا نام ہے جس میں انسان اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر ، نتائج اور کامیابی اور ناکامی کو اللہ پر چھوڑ کر پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے فرض کو پورا کرنے میں منہمک ہوتا ہے ، خواہ وہ فرض ایک انقلاب کو پیدا کرنے کی صورت میں پورا ہوا ۔ جس طرح فقرِ مذموم دنیا کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے اور دنیا اس کو منہ نہیں لگاتی ۔ اسی طرح فقرِ محمود کے قدموں میں دنیا پڑی رہتی ہے ، اور دنیا باوجود اپنی کشش اور زیبائش کے اس کو اپنے جال میں نہیں پھنسا سکتی ، جس طرح فقرِ مذموم ہوا و ہوس کا شکار رہتا ہے اسی طرح فقرِ محمود کی روح قناعت ہے ۔ اسلامی جہاد اسی فقر کی ایک صورت ہے ، یہ اسلام کی رہبانیت ہے ملک اور عزت اسی فقر کے معجزات ہیں ۔

فقر کی بلند ترین منزل وہ ہے جس میں انسان عجز و عبدیت کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہوتا ہے ۔ انسان اپنے آپ کو اپنے تمام اضافی اوصاف سے نہ صرف دولت و اقتدار بلکہ علم و قدرت سے بھی علیحدہ کر کے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس ذات کو اپنی صفات کے نور سے منور کر دیتا ہے ۔ وہ اللہ کے سامنے انتہائی نیازمندی کا نذرانہ پیش

کرتا ہے، اللہ اس کو اپنی طرح بے نیاز کر دیتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو ہوا اور خواہش سے خالی کر لیتا ہے، اللہ اس کو وحی سے بھر دیتا ہے اور اس کو صاحب الامر بنا دیتا ہے، انسان اپنے آپ کو صفر بناتا ہے، اللہ تعالیٰ اس صفر میں لامتناہی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک ابراہیمؑ آگ میں فرشتوں کی مدد سے منہ موڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔ ایک موسیٰؑ انتہائی غربت اور بے چارگی اور خوف کے عالم میں بھی اپنی کوئی خواہش یا ضرورت نہیں رکھتا بلکہ جو خیر اللہ تعالیٰ نازل کرے اس کا فقیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو خیر نازل کرتا ہے اس کا اندازہ اور حساب کون کر سکتا ہے۔ فقر کی یہ وہ منزل ہے جس پر محمد مصطفیٰؐ فخر کرتے ہیں، اسی طرح فقر کا دائرہ انسان کی فطری احتیاج سے شروع ہو کر ہر احتیاج سے بے نیازی کی منزل تک محیط ہے۔ اصطلاحِ تصوّف میں فقر ہستی سے گزر کر فنا اور نیستی تک پہنچنے کا نام ہے جہاں کسی قسم کی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ احتیاج تو موجود کی صفت ہے۔

صبر و رضا

اسلام تسلیم و اطاعت کو کہتے ہیں، ایک حقیقت کو تسلیم کرنا، ایک قانون کی اطاعت کرنا، حقیقت وہ جو پہلی شہادت لَآ اِلٰـہ الاّ اللہ میں مضمر ہے۔ قانون وہ جو دوسری شہادت محمّدٌ رسول اللہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے اور اس قانون اور حکم کو ماننے سے باہر اسلام کہیں نہیں ہے۔ کلمۂ لَآ اِلٰـہ الاّ اللہ محمّدٌ رسول اللہ علم اور ارادہ کی تمام وسعتوں اور گہرائیوں پر محیط ہے۔

رضا، ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے، وہ احساس جس سے تسلیم و اطاعت کو قبول کیا جاتا ہے، کیونکہ دین میں اکراہ نہیں ہے، علم و معرفتِ الٰہی کے تعلق میں تو اس ذہنی کیفیت کا جس کو رضا کہتے ہیں یہ تقاضہ ہے کہ بندہ اپنے خدا ہی کو کافی و شافی سمجھے، اسی کو نعم المولیٰ اور نعم النصیر سمجھے اور وہ امیر المومنین علی علیہ السّلام کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ "اے میرے اللہ تو تو میرا ایسا ہی رب ہے جیسا میرا دل چاہتا ہے، تو تو بھی مجھے ایسا بندہ بنا لے جیسا کہ تو پسند کرتا ہے" اور قانون اور حکم کے تعلق میں رضا کا یہ تقاضہ ہے کہ اسی کے قانون کو صراطِ مستقیم مان کر اس یقین کے ساتھ کہ دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح کا یہی راستہ ہے خواہ اس میں کتنی ہی تاریکیوں اور طوفانوں کا سامنا کرنا پڑے، اپنی تمام عبادات اور معاملات کو، اپنی نمازوں کو، اپنے جینے مرنے کو اسی کے لیے وقف کر دے۔ بہت سے لوگ حیاتِ دنیا پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عورتوں اور اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیر اور سواری کے رسالوں اور کھیتوں کی محبت زینت پاتی ہے۔ جب کوئی مصیبت اور امتحان کی گھڑی آتی ہے تو وہ پیچھے رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور مومن وہ ہیں جو صبر کرنے والے ہوتے ہیں، اپنا مال خرچ کرنے والے، صبح کو اٹھ کر استغفار کرنے والے، اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے، سب سے کٹ کر حزب اللہ میں داخل ہوتے ہیں، ان کی تمام زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضوان کی تلاش ہے، وہ اللہ سے راضی ہوتے ہیں اور اللہ ان سے راضی ہوتا ہے۔

اور یہی رضوانِ الٰہی جنّت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

گویا رضا کا پہلا درجہ یہ ہوا کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور رضا و رغبت سے ہر حال میں اس کے حکم اور قانون پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس قانون اور حکم پر عمل کرنے کے راستہ میں جو مصیبتیں آتی ہیں بندہ اس پر راضی ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بندے کو نہ اپنے نفع پر قدرت ہے نہ نقصان پر، نہ موت پر نہ حیات پر، نہ نشور پر، تمام نتیجے اسی کے ہاتھ ہیں۔ تمام امور اسی کی طرف پلٹتے ہیں اور وہ بڑا رحمٰن اور رحیم ہے۔ قضائے الٰہی اور قانونِ الٰہی کا نفوذ تو کافر اور مومن، فرشتہ اور شیطان سب پر ناگزیر ہے، مومن خوش ہو کر اس کو قبول کرتا ہے، کیونکہ اس کو علم ہے، کافر کو کراہت کے ساتھ اس کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کو علم نہیں ہے۔ اس طرح مومن کے لیے جبر میں ایک اختیار کا پہلو نکلتا ہے، جو اس چیز کو نہیں مانتا اس کے لیے اختیار بھی نہیں ہے۔ حقیقت جبر و اختیار کے بین بین ہے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ اس سے راضی ہوتا ہے اور اس کو اپنے بندوں میں اور اپنی جنّت میں داخل ہونے کی دعوت اور بشارت دیتا ہے۔ میں نے اس کو تیسرا درجہ کہا۔ حالانکہ رضائے خداوندی سے کوئی حال خالی نہیں۔ بندے کی رضا بھی تو رضائے الٰہی ہی کی ایک شان ہے، ورنہ راہِ حق میں صبر اور استقامت کی توفیق اور کہاں سے آتی ہے۔

صبر مصیبتوں میں استقامت کو کہتے ہیں، مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک تو وہ مصیبتیں ہوتی ہیں جو آدمی کے اپنے ہی کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے تمھارے اپنے ہاتھوں آتی ہے اور بہت سی غلطیاں تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ اور دوسری وہ مصیبتیں ہوتی ہیں جو راہِ حق میں پیش آتی ہیں۔ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں گے خوف سے اور جوع سے اور نقصِ مال سے اور نقصِ انفس و ثمرات سے۔ صبر دونوں حالتوں میں لازم ہے، اور دونوں حالتوں میں صبر اور صلوٰۃ کا ساتھ ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں انسان توبہ کرے اور ان سیئات سے باز آئے جن کی وجہ سے وہ مصائب میں گرفتار ہوا ہے اور صراطِ مستقیم کو پھر پکڑے اور دوسری صورت میں انسان

بلا پر نظر نہیں کرتا بلکہ بلاؤں کے بھیجنے والے پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ "نبلونکم" ہم تمھیں آزمائیں گے"۔ وہ ذکرِ کثیر کرتا ہے۔ وہ اور زیادہ غیر اللہ سے بے نیاز ہو کر اللہ ہی کا ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ امتحان لینے والا رحیم و کریم ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ مصیبت اس کی رحمت کا ایک بہانہ ہے اس لیے کہ مشیتِ الٰہی یہ ہے کہ بغیر امتحان کے انعام نہیں دیا جاتا، وہ ان بلاؤں کو اپنا شرف اور اعزاز سمجھتا ہے۔ اس مقام پر صبر اور شکر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جب مصیبتیں پڑتی ہیں تو صبر کرنے والے اور شدتِ خلوص سے کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ موت اور زندگی کا خالق جو صبر کرنے والوں کو اپنی معیت کے شرف سے سرفراز کرتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ) ان کو بشارت دیتا ہے۔ ان پر اپنی صلوٰت و رحمت نازل کرتا ہے۔ ان کو ہدایت یافتہ ہونے کی سند عطا فرماتا ہے۔ جو اللہ کی طرف بڑھتا ہے اللہ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ جس پر اللہ کی یہ مخصوص توجہ ہوتی ہے۔ اس کو اسی راہ میں شہید کرتا ہے اور اس شہادت کے بعد خود اس کی دیت بن جاتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! امام حسینؑ اور یزید کے مابین جو تنازعہ تھا وہ اسی بات پر تو تھا کہ یزید کو امام حسینؑ کی بیعت پر اصرار تھا اور امام حسینؑ کو بیعت سے انکار تھا۔ یہی مطالبہ یزید کے تخت نشین ہونے سے پہلے کیا جا رہا تھا، یہی مطالبہ یزید کے تخت نشین ہونے کے بعد مدینہ میں کیا گیا۔ یہی مطالبہ میدانِ کربلا میں بھی کیا گیا۔ اگر امام حسینؑ بیعت کر لیتے تو یہ تنازعہ ہی ختم ہو جاتا۔ ادھر امام حسینؑ بس بیعت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ہر شرط کے لیے تیار تھے۔ مدینہ واپس جانے کے لیے بھی تیار تھے، وطن چھوڑ کر سرحدوں پر اقامت اختیار کرنے کے لیے یا ملک چھوڑنے پر بھی تیار تھے، اور ان کو اس حکومت پر جو اعتراض تھے وہ انھوں نے متعدد موقعوں پر واضح کر دیئے تھے، یعنی یہ لوگ ظالم ہیں، لوگوں پر ظلم و جور سے حکومت کرتے ہیں۔ قانونِ الٰہی کو توڑتے ہیں، حلالِ خدا کو حرام اور حرامِ خدا کو حلال کرتے ہیں۔ نبیؐ کی سنت کو بدلتے ہیں۔ خراجِ سلطنت کو بجائے لوگوں کی بہبود پر خرچ کرنے کے اپنی عیش پرستی اور ناجائز اقتدار کو مستحکم کرنے پر خرچ کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کو بیعت سے انکار کیوں تھا؟ اس کا ایک سخن گسترانہ جواب یہ ہے کہ یزید کو بیعت پر اصرار کیوں تھا۔ جس وجہ سے یزید کو

بیعت پر اصرار تھا اسی وجہ سے امام حسینؑ کو بیعت سے انکار تھا، یزید چاہتا تھا کہ باطل کو امام حسینؑ کی تائید حاصل ہو جائے تو اس کو حق کی جگہ رکھ دیا جائے۔ امام حسینؑ کے لیے باطل کو باطل اور حق کو حق کہنا ایک تہیں سوز زندگیوں سے زیادہ عزیز تھا۔

رسولؐ کے روضہ پر ان کے لیے پناہ تھی نہ خانۂ خدا میں ان کے لیے امان تھی۔ کوفے والے ہدایت طلبی کے لیے خط پر خط بھیج کر اپنی حجت تمام کر رہے تھے۔ اس حجت کا جواب دینا ضروری تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ اپنے چند اعزا اور رفقا، اور پردگیانِ عصمت کو ساتھ لے کر یہ کہتے ہوئے مکہ سے کوفہ روانہ ہو گئے:۔

"قلمِ قدرت نے موت کا جو دن لکھ دیا ہے اس سے چھٹکارا نہیں۔ ہم اہلبیت کی وہی مرضی ہے جس میں اللہ کی رضا ہو۔ ہم اس کی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہمیں صابروں کا پورا پورا اجر دے گا۔ جو ہمارے ساتھ جان دینے پر تیار ہو اور لقائے الٰہی کے لیے اپنے نفس کو آمادہ کر چکا ہو وہ ہمارے ساتھ چلے اور میں تو انشاء اللہ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔"

راستہ میں لوگوں کو جو کسی گمان سے ان کے ساتھ ہو لیے تھے سمجھا سمجھا کر واپس کرتے گئے کہ "جو تلوار کی آنچ اور نیزوں کا زخم سہ سکتا ہو وہ ہمارے ساتھ چلے ورنہ یہیں سے واپس چلا جائے۔"

کوفہ کی سرحد پر پہنچ کر اس حجت کا حق ادا کر دیا جو کوفہ والوں نے قائم کی تھی۔ کوفہ والوں نے کہاں تک اپنے عہد کو نباہا یہ دوسری بات ہے۔

اپنے چند ساتھیوں کو لے کر کربلا کی شہادت گہِ عشق میں نکل آئے۔ ؎

"آتشِ حرب بھڑکا رہے ہیں لعیں، بندۂ زر، پرستارِ تیغ و سناں
اُف وہ گرمی، زمیں تپ رہی ہے لپٹ اور اُگلتا ہے ہر لحظہ آگ آسماں
نارِ نمرود میں چند ساتھی لئے، فاطمہؑ اور محمدؐ کا آرامِ جاں
وہ عطش کی تپش اور وہ کربِ عظیم، روزِ روشن بھی ہو جائے جس سے دھواں
اور پیشِ نظر لاشہ ہائے تپاں، خیمے جلتے ہوئے، ننگے سر بیبیاں"

لشکرِ یزید سے جنگ ہوئی، تمام اصحاب و اقربا شہید ہوئے۔ دوستوں اور ساتھیوں کو اس دنیا سے رخصت کیا، بھتیجے کی لاش کے ٹکڑوں کو سمیٹا، بھائی کے کٹے ہوئے ہاتھوں کو سینے سے چمٹایا، جوان بیٹے کے سینہ سے برچھی اور چھ مہینہ کے بچے کے گلے سے تیر نکالا۔

اور ایسی حالت میں جہادِ راہِ خدا میں دادِ شجاعت دے کر اپنے اس عہد کو جو اس بندۂ رب نے اپنے رب سے کیا تھا اس طرح پورا کر دیا جو پورا کرنے کا حق تھا۔

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝

مومن طمع سے مبرا ہوتا ہے!

اللہ کا رسولؐ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا تھا، ان آیات الٰہی میں انسان کے لیے مکمل ہدایت ہے یعنی زندگی اور انسان کی حقیقت اس کا مبدا، اور معاد، اس کی غرض وغایت، اس کی منزل اور مقصد، اس کی تقدیر، اس کے اللہ سے اور انسانوں سے اور کائنات سے صحیح تعلق کا یقین، اس کے حقوق و فرائض کی توضیح، زندگی کے سیدھے سچے راستے کا بیان ہے۔ اللہ کا رسولؐ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے ساتھ ساتھ انسانی قلوب کے ظرف کو اس قابل بناتا تھا کہ وہ ان آیات کو قبول کر سکیں۔ یہ تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی منزل ہے، ریاض اور عمل کا درجہ ہے، ایمان سے عملِ صالح پیدا ہوتا ہے جس ایمان کا شاہد عمل نہ ہو وہ غیر معتبر ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کے بغیر تزکیہ ناممکن ہے۔

تزکیہ کے ذریعہ انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کی رلم، ان کی باطنی اور مجموعی حقیقت جس کو کتاب کہتے ہیں اپنا سکے اور اس کا اپنے نفس اور اعمال پر اطلاق کر سکے جسے حکمت کہتے ہیں، یہ علم کی منزل ہے۔ علم کی منزل وہ ہے جب عالم اور معلوم کی دوئی مٹ جائے، جب قاری قرآن بن جائے یہی دنیوی و اخروی فلاح ہے، یہی نجات ہے، رضائے الٰہی ہے جس میں بندہ اللہ سے راضی ہے اور اللہ بندہ سے راضی ہے۔ یہ دنیا کے حوادث میں اطمینان کا مقام ہے، دارِ فنا میں حصولِ بقا کا راز ہے۔ انسان کی منزل، مقصد، تقدیر یہی ہے، جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔

گویا ایمان کی زندگی شعور اور نفس کی تطہیر ہے، تزکیہ ہے، اس کا ترفع ہے۔ زندگی کو ایک پست سطح سے بلند سطح تک لے جانا ہے۔ مطمحِ نظر کا بلند ہونا، اور مبلغِ علم کا وسیع ہونا ہے۔ کلامِ پاک میں کفر سے ایمان کی طرف آنے کو ظلمت سے روشنی کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف آنا کہا گیا ہے۔ یہ کھو کھو کر پانا اور مر مر کر جینا ہے۔ یہ نئی زندگی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس کو حیاتِ طیبہ کہا گیا ہے۔

اس زندگی کی ابتدائی شرط یہ ہے کہ انسان نفس کے زندان کو توڑے، اس کی تنگی سے آزاد ہو، کیونکہ زندگی خودی سے خدا کی طرف سفر ہے، قرآنِ حکیم میں نفس کی تنگی کو شحِ نفس کہا گیا ہے۔ شحِ نفس اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں حرص کے ساتھ بخل انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔

طمع جس میں حرص اور بخل دونوں شامل ہیں، زندگی کی صحیح قدروں کو نہ سمجھنے یا نہ قبول کرنے کا نتیجہ ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہ انسان کیلئے پیدا کی گئی ہیں اور انسان کو خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ انسان کے لیے تمام چیزوں کے پیدا کیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان جس طرح چاہے ان میں تصرف کرلے اور انکا استعمال کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان کو متاعِ حیات یا اسبابِ معیشت کے طور پر استعمال کرے۔ انھیں مقصدِ حیات نہ بنائے، ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا عدل ہے۔ اور عدل انسان کے دنیا سے تعلق کا بنیادی اصول ہے۔ کسی چیز کو اپنے صحیح مقام سے گھٹانا یا بڑھانا ظلم ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں انسان سے پست تر ہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ اپنی امیدوں اور خوف کو وابستہ کرنا ان کے ساتھ جذبے اور مقصد کی وابستگی اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنانا ہے۔ یہ اپنے آپ کو اپنے مقام سے گرانا، انسانی شرف کے مقام کو کھونا، خود اپنا احترام نہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جس طرح یہ بات ناپسند ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے مقام سے بڑھا کر انسانوں کا رب اور مَلِک اور الٰہ سمجھنے لگے اور فرعون بن جائے۔ اسی طرح یہ بھی ناپسند ہے کہ وہ ہمیشہ زمین ہی سے چمٹا رہے اور کُتّے کی طرح اپنی زبان منہ سے نکال کر رال ٹپکاتا رہے۔ اس شحِ نفس میں دنیا کی تمام چیزوں کی طمع شامل ہے۔ زندگی کی طمع، دولت کی طمع، طاقت کی طمع، اور یہ ایسا ہے کہ جیسے ایک پیاسا پانی کی تلاش میں سراب کی طرف بھاگے اور اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچکر معلوم کرے کہ جسے وہ پانی سمجھتا رہا تھا وہ سراب ہے۔ زندگی یا دنیوی طاقت یا دنیوی دولت کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھنے والا بلکہ ان کی طمع کرنے والا انسان ایک دن یہ بھی معلوم کرے گا کہ یہ سب چیزیں ایک دھوکا ہیں، ان چیزوں کی بنیاد کتنی کھوکھلی اور یہ چیزیں کتنی جلد فنا ہونے والی ہیں۔ متاعِ غرور اور متاعِ قلیل ہیں، اور ان سے وہ

توقعات پوری نہیں ہوتیں، جو ان سے باندھی تھیں اور چونکہ ان سے وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں اس لئے طمع طمع کو اور بڑھاتی ہے، اور زندگی کی جگہ زندگی کی ہوس لے لیتی ہے۔

طمع جہالت کی دلیل ہے، اس لیے کہ انسان طامع اسبابِ معیشت کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے اور ان کی کثرت میں اطمینان اور خوشی کو تلاش کرتا ہے۔

طمع ذلتِ نفس کی دلیل ہے اس لیے کہ انسانیت کے شرف اور احترام کے منافی ہے۔

طمع کم ہمتی اور جُبن کی دلیل ہے۔ کہا گیا ہے کہ شیطان ہے جو تمھیں فقر سے ڈراتا ہے۔

طمع بے یقینی کی دلیل ہے، اس لیے کہ یہ توکل کی ضد ہے۔

اور اس کے مقابلے میں دینِ اسلام علم ہے، شرف و احترامِ انسانیت ہے، علوِ ہمت ہے اور ایثار ہے، اور ایمان و یقین ہے۔

اسی طرح یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ زر کی محبت اور اللہ کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں اور حریص دل کا اور سچی زبان اور امین ہاتھ کا ساتھ نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ حرص کی مذمت محکم آیات میں جو کسی تاویل و تفسیر سے بے نیاز ہیں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سود کو جو حرصِ زر کی ایک صورت ہے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی باندھنی ہے۔ اللہ تعالیٰ سود میں برکت نہیں دیتا، صدقات میں برکت دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ سب تمھارے لیے پیدا کیا گیا ہے اور تم کو اور تمام جن و انس کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ عورتوں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے چنے ہوئے ڈھیروں اور نشان کیے ہوئے گھوڑوں اور چارپایوں اور کھیتوں کی خواہش کو لوگوں کی نگاہ میں زینت دی گئی ہے۔ یہ حیاتِ دنیا کی متاع ہیں اور اچھا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دی گئی ہے۔ ان ہی سونے اور چاندی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھ داغی جائے گی کہ یہ وہی ہے جس کو تم اپنے نفس کے لیے جمع

کرتے تھے۔ اب جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔ کہا گیا ہے کہ اگر تمھارے باپ دادا، بیٹے، اولاد، بھائی، بیویاں، رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے جمع کر رکھے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جو تمھیں بہت اچھے لگتے ہیں تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے عزیز ہیں تو تم اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ ایک فساد زدہ اور زوال آمادہ معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہاں اگر کوئی کسی کا سرپرست نہ ہو کوئی یتیم ہو تو اس کا اکرام نہیں، کوئی عاجز یا مسکین ہو تو اس کی مدد کرنے اور پیٹ بھرنے کی طرف کسی کی توجہ نہیں، لوگ تمام میراث کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں، دوسروں کا حق بھی غصب کر لیتے ہیں حالانکہ ہر چیز کا وارث خدا ہے۔ اور جی بھر کر مال سے محبت کرتے ہیں، یہ فساد معاشرہ کو عذاب الٰہی کی دعوت دیتا ہے۔ گویا حرص فسق ہے جو بندے کو اللہ کی ہدایت سے محروم کرتا ہے اور فساد ہے جو معاشرے کو عذاب الٰہی کا مستحق بناتا ہے۔

امانت داری

امانت، امن، ایمان سب ایک ہی مادّہ "ا، م، ن" سے نکلتے ہیں۔ اس مادّہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قلب یا نفس کے اطمینان کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے قلب کو ہر قسم کے شک اور تردد سے اطمینان حاصل ہو، امن اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں ہر قسم کے خوف سے اطمینان حاصل ہو۔ امانت داری وہ صفت ہے جس سے ایک شخص کو اپنے مال و متاع کے متعلق دوسرے کی خیانت سے اطمینان حاصل ہو۔ اس قلب کے مطمئن ہونے کی قدرِ مشترک کی وجہ سے امانت داری ایمان کا جزو ہے۔ سورۂ المؤمنون اور المعارج میں مومنین کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں، جو فلاح پانے والے ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہیں، جنت میں عزت پانے والے ہیں اور جو انسانی فطرت کی اس کمزوری سے آزاد ہوتے ہیں کہ وہ بہت جلد بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو جاتا ہے، جہاں کچھ مصیبت آن پڑی واویلا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالات بہتر ہوئے تو ممسک اور بخیل بن جاتا ہے۔" ان مومنین کی صفات میں دونوں جگہ بتایا گیا ہے کہ "وہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت کرنے والے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کی تو ان سب نے ڈر کر اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ اس لفظ امانت کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں۔ عقل، معرفت، عشق یا اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا عکس اور ظہور، طاعتِ حق، ولایت و امانت، عدل و انصاف وغیرہ وغیرہ۔ اس بحث میں پڑے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوق کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ ان کو اس طریقہ پر استعمال کرنے کے لیے جبلّی طور پر مجبور ہیں جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو طاقتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، اس کی زندگی، اس کے اعضاء و جوارح، اس کی سمع و بصر اور افئدہ، اس کی عقل اور اس کا قلب، اس کا سماج

اس کا فطری ماحول، اس کی مال و دولت وہ سب امانت کے طور پر عطا فرمائی ہیں، اور مالک کی مرضی کے خلاف امانت کو استعمال کرنا صریحی خیانت ہے۔ امانت کو قبول کرنا ان شرائط کو پوری کرنے کی بھی ذمہ داری قبول کرنا ہے جو اس امانت سے وابستہ ہیں، لیس عَلَی الأُمّیین الّا الیمین: اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کو بطورِ امانت قبول کرنے کی شرط اور ذمہ داری یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ظلوم و جہول انسان ظلمت سے نور کی طرف، جہل سے علم و معرفت کی طرف اور ظلم سے عدل کی طرف آئے۔

قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ تعالیٰ کی خیانت مت کرو اور اس کے رسولؐ کی خیانت مت کرو اور نہ اپنی امانتوں کی خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی خیانت تو یہ ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور طاقتوں کو استعمال نہ کریں اور ضائع کر کے اس کے غضب کے مستحق بن جائیں اور ان کے غلط مقاصد کے لیے استعمال کر کے فساد فی الارض پیدا کریں اور گم کردہ راہ ہو جائیں۔ رسولؐ کی امانت وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو وحی کے ذریعے سپرد کیا اور اللہ کے رسولؐ نے تبلیغ و ہدایت کے ذریعہ ہمارے سپرد کیا۔ اکملت لکم دینکم۔ اس بات کی تصدیق ہے۔ اور مومنین اس بات کے شاہد ہیں کہ اس صادق و امین رسولؐ نے اس امانت کا، اس ناموسِ کبریٰ کا حق ادا کر دیا جس طرح چاہیئے تھا۔ قرآنِ حکیم میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان سے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ کی زبان سے اِنّی لَکُم رَسُولٌ امین کا کلمہ دہروایا ہے۔ حضورؐ بعثت سے پہلے بھی لوگوں میں الامین کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ گویا عالمِ انسانیت کی طرف اس حقیقت کی تصدیق اور شہادت تھی کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قائم کرے۔ وہ ملتِ مسلمہ جس کی تاسیس حضورؐ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی رسولؐ کی امانت ہے جو ہمارے سپرد کی گئی ہے۔ رسولؐ سے خیانت یہ ہے کہ ہم نے اس کے لائے ہوئے دین کو مسخ تو نہیں کر دیا۔ اس کو افسانہ طرازیوں اور فرقہ بازیوں میں گم تو نہیں کر دیا، نماز کو ضائع کر کے توحید کی بنیاد تو منہدم نہیں کر دی، اپنے ہوا و ہوس اور دنیوی جاہ و دولت کے بتوں کو تو

نہیں پوجنا شروع کر دیا، الزکوٰۃ کو بند کر کے معاشی عدل کو تو برباد نہیں کر دیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سے غافل ہو کر ظلم و فساد کے پھیلانے کے ذمہ دار تو نہیں بنے، معاشرے میں لسانِ صدق اور دستِ امین تو مفقود نہیں ہو گئے۔ عزیزو! جب کسی معاشرہ میں سچی زبان اور امین ہاتھ ختم ہو جاتے ہیں تو پھر اس معاشرے کو عذابِ الٰہی سے بچانے والی زمین و آسمان میں کوئی طاقت نہیں ہے۔

جس آیت کا ترجمہ میں نے اوپر بیان کیا اس میں اللہ کی خیانت کے بعد اپنی امانتوں میں خیانت کا ذکر ہے۔ امانت وہ مال ہے جو کسی کے پاس رکھا جائے، یا وہ راز ہے جو کسی کے سپرد کیا جائے۔ اس کے متعلق ہمیں حکم ہے کہ "پس اگر تم میں سے کوئی دوسرے کو امین سمجھ لے تو وہ شخص جسے امین سمجھا گیا ہے اسے لازم ہے کہ دینے والے کی امانت ادا کرے۔ عورتیں بھی مردوں کے لیے امانت ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے "اخذتموھن بامانۃ اللہ" تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ امانت داری کی صفت اپنے اور پرائے سب کے ساتھ لازم ہے۔ مشرکوں کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ نہ قرابت کا خیال کرتے ہیں نہ عہد و پیمان کا پاس کرتے ہیں۔ اہلِ کتاب کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں امانتدار لوگ بھی ہیں جن کے پاس اگر ایک خزانہ بھی امانت رکھ دیا جائے تو وہ اس کو واپس کر دیں گے، اور ایسے بھی ہیں جو ایک دینار بھی خیانت سے باز نہیں آتے اور اس کا جواز پیش کرتے ہیں کہ ایک غیر ملت کے لیے وہ کسی عہد کے پابند یا امانت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ جواز اور یہ عذر بین الاقوامی سیاست کی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جس کا دستور یہ بن گیا ہے کہ اپنی قوم کے اندر ایک ضابطۂ اخلاق پر عمل ہو اور غیر قوموں کے ساتھ ضابطۂ اخلاق کی بجائے اپنے مفاد کے تقاضے ہی دستور بن جائیں، تم دیکھو کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی قوموں نے جن اسلامی ملکوں کو بطور امانت حاصل کیا تھا اور جن کے لیے انھوں نے عالمی ضمیر کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ ہونا قبول کیا تھا۔ انھوں نے امانت کا کیسا حق ادا کیا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی بھی اپنے آپ کو حضرت یوسفؑ کے امین بننے کا اور حضرت یعقوبؑ کے سامنے جوابدہ ہونیکا دعویٰ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اپنے اور غیر کی تفریق کیے بغیر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بیشک

اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو پہنچا دو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔" اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔" ہجرت کے وقت بھی رسولؐ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ حضرت علیؑ کو خاص اس کام پر مامور کیا تھا کہ امانتیں ان کے مالکوں کو پہنچا دیں اور مشرکین اور یہود پر حجت اس وقت قائم ہوئی جب انھوں نے عہد کی خلاف ورزی کی۔

جب کوئی ذمہ داری کسی کے سپرد کی جائے تو ہمیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ شخص قوی ہو اور امین ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجنے کا کام جس کے سپرد کیا اس کی صفت بھی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ذی قوۃ ہے اور امین ہے۔ دینِ حق کی تبلیغ کا کام جس کے سپرد کیا وہ بھی ناصح امین ہے۔ جس عفریت نے حضرت سلیمانؑ کو تختِ بلقیس لانے کی پیش کش کی تھی اُس نے بھی اپنی تعریف قوی امین کہہ کر کی تھی۔ جنابِ شعیبؑ کی صاحبزادی نے حضرت موسیٰؑ کی سفارش اپنے باپ سے یہ کہہ کر کی تھی جسے اجرت پر رکھا جائے، ان میں سے بہتر وہی ہوگا جو قوی ہو اور امین ہو۔ قوی کے معنی یہ ہیں کہ جو کام اُسے سپرد کیا گیا ہے اس کو پورا کرنے کی اس میں اہلیت ہو اور امین کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صدق و دیانت کی صلاحیت ہو کہ اپنے فرض کو اس طرح پورا کرے جیسا پورا کرنے کا حق ہے۔

بددیانتی

دیانت میں اپنے اصل و مخرج کے اعتبار سے قرض لینے، قرض دینے، قرض اتارنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کے ہر مقام پر انسان کے کچھ حقوق اور فرائض ہوتے ہیں۔ اس کے فرائض اس پر ایک طرح کا قرض ہیں جس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرنا دیانت ہے۔ دیانت دین کا اہم مخرج ہے۔ دیانت کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا دین کا۔ عبادات اور معاملات، غرض زندگی کے تمام وظائف اس کے احاطہ میں ہیں۔ انسان پر اس کے اللہ کے حقوق ہیں، اس کے نفس کے حقوق ہیں، اللہ کے بندوں کے حقوق ہیں۔ یہ سب اس کے اوپر قرض ہیں۔ اپنی تمام مذہبی اور اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں سے صداقت کے ساتھ عہدہ برآ ہونا دیانت ہے۔

اللہ کی عبادت خالصتہً اس تقاضے سے کرنا کہ ہم عبد ہیں اور وہ معبود ہے دیانت ہے۔ دکھاوے کے لیے عبادت کرنا اللہ تعالیٰ سے بددیانتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے دل میں نہ اس کی جزا پر امید رکھنا نہ اس کی سزا کا خوف رکھنا، یا اسلام کے نام پر ذاتی اقتدار اور منفعت کی پیروی کرنا، یا اصلاح کے بہانے اللہ کی زمین پر فساد پھیلانا بددیانتی ہے۔ کلامِ پاک میں بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش ہے، اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش حقیقت میں اپنے آپ ہی کو دھوکا دینا ہے۔

اپنے نفس سے بددیانتی یہ ہے کہ انسان کے قول و عمل میں تضاد ہو۔ قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہے۔ منافقین کے لیے حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ منافقین حضورؐ کے پاس آ کر کہتے ہیں کہ تم اللہ کے رسولؐ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس بات کا شاہد ہے کہ محمدِ مصطفیٰؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی اس کا فیصلہ

ہے کہ منافق جھوٹ کہتے ہیں"، گویا ایک سچی بات کو غلط مقصد کے لیے استعمال کرنا بد دیانتی ہے۔ وہ قول جس کا شاہد عمل نہ ہو بے اعتبار ہے اور کذب ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور رسولؐ کو مانتے ہیں اور اس ماننے کی ذمہ داریوں کو نہ سمجھنا اور عملاً اللہ کو اللہ اور رسولؐ کو رسولؐ نہ ماننا اور نہ ماننے کی کوشش کرنا اپنے آپ سے بد دیانتی ہے۔ یہ روح و قلب کا مرض ہے اور ہر مرض کی طرح جس کے علاج کی کوشش نہ کی جائے یہ مرض بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اپنے نفس سے بد دیانتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک بات جس کو انسان غلط سمجھتا ہے اس کو کسی ادنیٰ منفعت کی خاطر صحیح ثابت کرنے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے ایک امانت کی طرح اس کو دی ہیں صرف کرے، اور جو برائی وہ اس طرح کماتا ہے اس کے مقابلے میں بڑی سے بڑی منفعت ثمن قلیل یا ادنیٰ منفعت ہی ہے۔

یہ مثالیں داخلی بد دیانتی کی ہیں۔ دیانتداری کے الفاظ کا استعمال عام طور سے معاشی معاملات کے لیے کیا جاتا ہے۔ لیکن داخلی بد دیانتی پر زور دینا اس لیے ضروری ہے کہ خارجی بد دیانتی کی جڑ یہی داخلی بد دیانتی ہے۔ اور پھر داخلی بد دیانتی کو خارجی بد دیانتی اور بھی شدید کرتی چلی جاتی ہے۔ دینِ اسلام میں عبادات اور معاملات کے تعلق پر زور اسی وجہ سے دیا گیا ہے، اگر تم کسی کو دیکھو کہ وہ شخص رسمی عبادات بجا لاتا ہے لیکن لوگوں سے لین دین اور تعلقات میں بد معاملہ ہے تو سمجھ لو کہ اس کی عبادات میں بھی بد دیانتی شامل ہے جو اس کی عبادات کو مسخ کر رہی ہے، اگر کوئی شخص منکر اور فحشاء سے نہیں بچتا تو یہ اس کی نماز کی نامقبولیت کی دلیل ہے۔

معاملات میں کچھ فرائض تو وہ ہیں جو ہم پر ہماری زندگی میں جو مقام ہے اُس مقام کی وجہ سے عائد ہوتے ہیں، مثلاً ہم کسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کسی قوم کے ایک فرد ہیں، اور ہم انسان ہیں، خاندانی تعلقات سے جو فرض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کوتاہی کرنا اور انصاف نہ کرنا بد دیانتی ہے، دینِ اسلام میں قرابت داروں کے حقوق پر بار بار زور دیا گیا ہے، اس لیے کہ خاندان اسلام کے نزدیک تمام معاشرہ کا

بنیادی ادارہ ہے، عدل اور احسان کے ساتھ ایتائے ذی القربیٰ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ جو شخص ایتائے ذی القربیٰ نہیں کرتا وہ معاشرے میں عدل اور احسان بھی نہیں کر سکتا۔ خاندانی تعلقات کے سلسلہ میں بد دیانتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جس کو آج کل کی زبان میں اقربا پروری کہا جاتا ہے۔ یعنی دوسرے لوگوں کے حقوق مار کر اور اپنے رسوخ و اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے بھائی بھتیجوں کا گھر بھرنا، ایتائے ذی القربیٰ کا جواز اور اس کے حدود معاشرے میں عدل اور احسان کا قیام ہے۔

قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے اگر ہم ذاتی منفعت کو قومی مفاد اور بہبود پر ترجیح دیتے ہیں تو یہ ہماری بد دیانتی ہے۔ اگر ہماری نگاہ میں کوئی قانون عدل اور انصاف کے تقاضے کے خلاف ہو تو بہ حیثیت شہری ہمارا حق بلکہ ہمارا فرض ہے کہ اس کو بدلوانے کے لیے اقدام کریں۔ لیکن مروجہ قانون کو توڑ مروڑ کر یا دیدہ و دانستہ غلط شہادتیں بہم پہنچا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا بد دیانتی ہے۔

کچھ فرائض وہ ہوتے ہیں جو معیشت کے سلسلہ میں ہمارے عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم سے کہا گیا ہے کہ ناپ تول میں کمی زیادتی نہ کریں، یہ نہ کریں کہ لیتے وقت ایک پیمانہ استعمال کریں اور دیتے وقت دوسرا پیمانہ، میزان کو قائم رکھیں اس میں تقصیر نہ کریں، یہ میزان حق اور عدل کی میزان ہے، اپنے اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرے کا حق غصب کرنا اور اس کی محنت کا استحصال کرنا بد دیانتی ہے۔ مزدور کو اس کی پوری اجرت نہ دینا یا اس کی اجرت کو اس سے کم مقرر کرنا جو حق اور انصاف کا تقاضہ ہے بد دیانتی ہے، ایک مزدور کا اپنے کام کو صحیح اور پوری طرح سے سرانجام نہ دینا بد دیانتی ہے، خریدار کو ایک ایسی چیز دینا جو نظر کچھ آتی ہو اور حقیقت میں کچھ اور ہو اور ہر طرح کی ملاوٹ یا ملمع سازی بد دیانتی ہے۔ حضورؐ کی اس گندم فروش کو تنبیہ کا قصہ جس کے گندم کے ڈھیر میں اوپر کے گندم خشک اور اندر کے گیلے تھے سب کو معلوم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی

عہدہ یا منصب پر فائز ہے تو اپنے فرائض میں جہالت یا غفلت یا کوتاہی یا اس عہدہ اور منصب کا غلط استعمال بددیانتی ہی کی مختلف صورتیں ہیں، عدالتوں اور حکّام سے اپنے حق اور انصاف کے مطابق اپنا حصّہ لینے کی سعی کرنا مستحسن ہے لیکن حکام کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کروانا یا رشوت لے کر کسی کے حق میں فیصلہ کرنا خواہ وہ فیصلہ صحیح کیوں نہ ہو بددیانتی ہے۔

کچھ فرائض وہ ہیں جو ہمارے وعدوں سے اور معاہدوں سے اور امانتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں حکم ہے کہ اپنے وعدوں کو وفا کریں اور عہد کو پورا کریں، حضورؐ نے اپنے وہ عہد بھی پورے کیے جو اپنے دشمنوں سے کیے تھے۔ وعدے اور عہد کر کے پورا نہ کرنا یا پورا نہ کرنے ہی کی نیت سے وعدہ اور عہد کرنا بددیانتی ہے۔ کسی امانت کے کلّی طور پر شرائط کو پورا نہ کرنا بددیانتی ہے۔ اور اگر وسیع تر معنی میں دیکھا جائے تو ہر بددیانتی امانت میں خیانت ہی کی ایک صورت ہے۔

سادگی

سادگی کسی سماجی فیشن کا نام نہیں ہے، نہ یہ کوئی معاشی پالیسی ہے بلکہ یہ ایک اخلاقی صفت ہے، انسانی مزاج کی ایک کیفیت ہے جو آدمی کی سوچ میں، اس کی گفتگو میں، اس کے سلوک میں، اس کے لباس میں، اس کے طرزِ معاشرت میں، غرض اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبے میں ظاہر ہوتی ہے، اور چونکہ ہمارے ظاہری طور طریق، آداب و عادات کا اثر ہمارے مزاج اور اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے مزاج اور اخلاق میں سادگی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سادہ طرزِ زندگی اختیار کیا جائے (لیکن اگر سادگی کو محض ایک فیشن کے طور پر اختیار کیا جائے یا ایک پالیسی کے طور پر اس کا پرچار کیا جائے تو یہ یا تو ریاکاری ہے جو سادگی کی ضد ہے یا وہ سیاست ہے جس کا سادگی سے کوئی تعلق نہیں) اگر ہمارا سادہ لباس ہمارے اندر صحیح انسانی مساوات کا جذبہ پیدا نہیں کرتا تو اس سے فائدہ؟ بڑی سے بڑی فرعونیت سادہ سے سادہ لباس میں بھی کی جاسکتی ہے بلکہ فرعونیت کو تو اس کا طمطراق ہی زیب دیتا ہے۔ سادہ لباس میں تو وہ اور زیادہ خطرناک اور گھناؤنی ہو جاتی ہے۔

سادگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زندگی کو ہر قسم کی زیب و زیبائش سے مُعرّا کر کے بالکل سپاٹ بنا دیا جائے، سادگی زینت کی منافی نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے کیا آسمان کیا زمین ہر شئے کو زینت کے ساتھ خلق کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار "زینۃ الکواکب" زَیّنّاھا للناظرین کا ذکر آیا ہے۔ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور خلق خلقِ احسن ہے، حق اور حسنِ تخلیق کے دو عناصر ہیں۔ تخلیق کا باطن حق ہے اور ظاہر حسن ہے اور ظاہر و باطن ایک ہی حقیقت ہے۔

زمین پر جو کچھ اُگایا ہے وہ زمین کے لیے زینت ہے۔ دنیا کی اچھی چیزوں کو حیاتِ دنیا کی زینت بتایا گیا ہے۔ حسنِ عمل کا امتحان اِس طرح بھی ہوتا ہے۔ ایک زینت وہ ہے جس کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ لباس ستر پوشی کے لیے اور زینت کے لیے ہے عبادت کے وقت اور مقام پر زینت اختیار کرو۔ زینت و زیبائش کی چیزیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ ان کو کون حرام کر سکتا ہے ؟ عورتوں کے لیے تو زیب و زیبائش فطرت کا تقاضہ ہے۔ ہاں نامحرموں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے خود نمائی کرنا "تبرّجِ جاہلیت" ہے۔ دوسری طرف حضرتِ موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے گروہ کے تموّل اور زینت کی اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ وہ زینت لوگوں کو اللہ کے راستے سے ہٹانے کا باعث تھی۔ قارون کی زینت نے لوگوں کے دلوں میں یہ تمنّا پیدا کر دی کہ کاش وہ بھی اسی طرح کی شان و شوکت والے ہوتے۔ وہ زینتیں جن سے کسی فرد یا گروہ کے تفوّق اور برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جن سے معاشرہ میں حقیقی انسانی قدریں ختم ہو کر نام و نمود کی جھوٹی قدریں رواج پاتی ہیں، مذموم ہیں۔ وہ زینتیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شکر گذاری کے ساتھ قبول کرنے کے جذبے سے پیدا ہوتی ہیں وہ مستحسن نعمت ہیں۔ ایک طرح کی عبادت ہیں اور قلب و روح کی سادگی اور معصومیت پر دلالت کرتی ہیں۔

اِس اخلاقی صفت کا ایک منفی پہلو ہے اور ایک مثبت پہلو۔ منفی پہلو یہ ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بڑا سمجھنا، لوگوں کے سامنے اترانا، تکبّر اور تفاخر سادگی کے منافی ہیں۔ خواہ اس تکبّر و تفاخر کی بنیاد جاہ و دولت ہو، نام و نسب ہو یا علم و تقویٰ۔ یہ اِترانا اور فخر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اترانے والا شخص خود اس بات سے واقف ہے کہ اپنی شخصیت کا جو تاثر وہ دنیا کو دینا چاہتا ہے وہ اس کا اہل نہیں ہے۔ جو شخص جانتا ہے کہ اس کے اندر عزت اور احترام کے قابل کوئی صفت نہیں وہ اپنی دولت کی یا اپنی طاقت کی یا اپنے نسب کی نمائش کر کے لوگوں کی نگاہوں میں معزّز و محترم ہونا چاہتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی عزت خود کرنا جانتے ہیں اس

بات کے متمنی نہیں ہوتے کہ لوگ ان کی عزت کریں جو شخص اپنے علم کے کھوکھلے پن سے واقف ہے وہی اپنے علم کی نمائش سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور نیکی کا لبادہ اکثر وہ شخص اوڑھتا ہے جس کو اپنی روح کے کچھ ناسور چھپانے ہوتے ہیں۔

میر انیس فرماتے ہیں:

عزت جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

سادگی مکاری اور چالاکی کے منافی ہے۔ جس کی طبیعت میں سادگی ہے وہ سچی بات کو فوراً قبول کرتا ہے۔ جس کی طبیعت میں سادگی نہیں ہے وہ لوگوں پر بدگمانیاں کرتا ہے۔ اپنے توڑ جوڑ میں مصروف رہتا ہے، لوگوں کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ ان کی غیبت کرتا ہے، دوسروں پر تمسخر کرتا ہے، ان پر نام دھرتا ہے اور اپنے عقل کے زعم میں سچائی کو قبول کرنے میں عار سمجھتا ہے، اس کی دماغی الجھنیں اور ناہمواریاں اس کو روشن حقیقتوں کو دیکھنے سے باز رکھتی ہیں۔

سادگی کی مثبت بنیاد معرفتِ نفس ہے جس کے بعد نمائشی چیزیں نہ انسان کو مرعوب کر سکتی ہیں نہ اس کے لیے ان میں کوئی رغبت رہتی ہے۔ ایسا شخص اپنے سے زیادہ حیثیت کے لوگوں کو انسان سے کوئی برتر ہستی نہیں سمجھتا، اور اپنے سے کم حیثیت آدمی کو انسان سے کمتر مخلوق نہیں سمجھتا۔ ایسے لوگ دنیا میں کتنے کم ہیں جن کے مزاج میں یہ سادگی ہو کہ وہ انسان کو انسان سمجھ سکیں، اور اپنے آپ کو انھیں میں سے ایک فرد سمجھیں۔ سادگی سے متصف انسان اپنے آپ کو اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ سمجھتا ہے۔ اللہ کا رسولؐ ہو کر اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کہتا ہے۔

سادگی بنیادی طور پر خلوص کا نام ہے، اس کی نگاہ تمام فریب اور الجھنوں سے گذر کر تصنع کی تمام پیچیدگیوں کو چیر کر اصل حقیقت تک پہونچ جاتی ہے۔ سادگی اس کو وہ نظر بخش دیتی ہے کہ ایک عام آدمی کی طرح بازاروں میں چلنے پھرنے

والے انسان کے رَحْمَةً لِلعَالَمِين ہونے کی تصدیق کرسکتا ہے۔ جن کی طبیعت میں الجھاؤ ہوتا ہے وہ حجتیں کرتے ہیں۔ معجزوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن کی طبیعت میں سادگی ہوتی ہے ان کے لیے روئے و آوازِ پیمبر معجزہ ست۔

طبیعت کی سادگی میں فطرت کا عطا کردہ وہ بھولپن ہے جو یا تو بچّوں کی معصومیت میں ملتا ہے یا پیمبروں کی عصمت میں۔ انجیل کے اس قول میں کہ حقیقت کو عقلمند آدمیوں سے چھپایا جاتا ہے اور بچّوں پر اس کو واضح کیا جاتا ہے اسی صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بر خود غلط لوگ ایسے آدمیوں کو "سفیہ" سمجھتے ہیں۔ اس بات میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ حقیقت کو تسلیم کرنے میں بھی عوام الناس کے شریک بن جائیں۔ قرآنِ حکیم میں بتایا گیا ہے کہ سفیہ وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنی طبیعت کی سادگی سے بلا چون وچرا حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کی دماغی الجھنیں اور جھوٹا احساسِ برتری حقیقتوں کو دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔

طبیعت کی سادگی ہی وہ زمین ہے جس پر تمام اخلاقِ فاضلہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اگر یہ بنیاد موجود نہیں ہے تو بلند اخلاق کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ زمین ہی بنجر ہے تو اس پر سوائے خس وخاشاک کے کیا اُگے گا۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں بار بار طبیعت کی سادگی پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے غرور سے اپنے گال مت پھلاؤ اور زمین پر اکڑ اکڑ کر مت چلنا۔ چال ڈھال میں میانہ روی اختیار کرنا۔ اپنی آواز دھیمی رکھنا۔ گدھے کی آواز کتنی کریہہ ہوتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے اپنی کٹ حجتی سے اس کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔ بیشک کان اور آنکھ اور قلب سے اور ان سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔ اور زمین پر اکڑ اکڑ کر مت چلا کرو۔ تم اس دھماکے کی چال سے زمین کو نہیں پھاڑ ڈالو گے نہ تم پہاڑ کے برابر لمبے ہو جاؤ گے۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ رحمٰن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں۔ لغو باتوں میں الجھنے اور کٹ حجتی کرنے سے بار بار منع کیا گیا ہے۔

حضورؐ کی زندگی سادگی کا بہت حسین نمونہ تھی۔ حضورؐ ساری عمر مٹی کے مکان میں رہے۔ ہر شخص کو ان تک رسائی تھی۔ غریب کو افلاس کی وجہ سے حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ مال یا طاقت کی وجہ سے کسی کو محترم نہیں سمجھتے تھے۔ قوی اور ضعیف کا حق ان کے نزدیک برابر تھا۔ جو آپ کے پاس بیٹھتا۔ آپ کبھی گھبرا کر اُس سے روگردانی نہیں کرتے تھے۔ مصافحہ کرتے وقت اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے جب تک وہ خود ہی نہ چھوڑ دے۔ زمین پر بیٹھ کر بکریوں اور بھیڑوں کا دودھ دوہ لیتے تھے۔ اپنے کپڑوں اور جوتوں کی خود ہی مرمت کر لیتے تھے۔ لباس سادہ ہوتا تھا۔ بالوں کے بنے ہوئے یا سُوتی کپڑے پہنتے تھے۔ آپ کے اور آپ کے غلام کے رہن سہن میں کوئی فرق نہ تھا۔ اسی کے ساتھ آپ صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ خوشبو سے شوق تھا۔ تمام لطیف و جمیل چیزوں سے ایک فطری لگاؤ تھا۔ اگر آپ کی کوئی غیر معمولی تعظیم کرتا تو آپ ناراض ہوتے۔ حضورؐ کی یہ سادگی آپ کی عبودیت کا مظہر تھی۔ طبیعت میں بھولا پن اور معصومیت اتنی تھی کہ معاندین حضورؐ کو ایذا دینے کے لیے طعنہ دیتے تھے کہ وہ تو بالکل کان ہیں یعنی کانوں کے کچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دو کہ یہ تمھارے لیے بھلائی کا کان ہے۔ اللہ کا رسولؐ اللہ میں ایمان رکھتا ہے۔ مومنوں کا یقین کرتا ہے۔ تم میں جو ایمان لائے ہیں ان کے لیے رحمت ہے۔ حضورؐ کا کلام بہت مختصر سیدھا سچا ہوتا تھا۔ ہر شخص اپنے ظرف اور مقام کے مطابق اس سے مستفیض ہوتا تھا۔ جاہل سے جاہل آدمی اس فیض سے محروم نہیں رہتا تھا۔ اور عالم سے عالم بات کی تہ تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر حضورؐ کے وداعی حج کے خطبے ہی کو دیکھ لو۔ یہی خصوصیت اللہ کے کلام کی ہے۔ اس میں کوئی اُلجھاؤ اور کجی نہیں ہے۔ کلام میں جب اتنی گہرائی اور بلندی موجود ہوتی ہے تو بیان میں سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ اللہ۔ اس سادگی میں کتنے بناؤ ہیں۔ اس بے رنگی میں کتنے رنگ چھپے ہوئے ہیں۔

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

حضورؐ کا ایک لقب اُمّی بھی ہے ۔ اکثر علماء نے اس لفظ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ حضورؐ کا قلبِ مبارک تمام ہوا اور عادت، وسوسوں اور اندیشوں سے، ظن و گمان سے پاک ایک لوحِ سادہ کی طرح تھا جس پر علومِ الٰہیہ کے نقوش جوں کے توں ثبت ہوتے تھے ۔ وحیِ الٰہی کی منزل بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس قلب پر وحیِ الٰہی نازل ہو وہ اُمّی ہو ۔ جب تک انسان اپنے قلب و روح میں کسی نہ کسی حد تک اُمّی ہونے کی صفت پیدا نہ کرے اُس وقت تک حقیقت اُس پر روشن نہیں ہو سکتی ۔ جب تک جامعۂ شعور تمام داغ دھبّوں سے پاک نہ ہو جائے اور اس میں سادگی کی صفت پیدا نہ ہو اس وقت تک وہ اللہ کے رنگ کو صبغۃ اللہ کو کس طرح قبول کر سکتا ہے ۔ **

بزرگوں کی تقلید اچھی باتوں میں

محض بزرگوں کی تقلید کرنے سے تو کام نہیں چلتا۔ مشرکینِ عرب کے سامنے جب اسلام کو پیش کیا گیا تو ان کا عذر یہی تھا کہ ہم یہ نئی اور عجیب باتیں قبول نہیں کرتے اور ہم تو اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں اور اس رویّہ کو سنت الاوّلین کہا گیا ہے۔ یعنی جب بھی لوگوں کے سامنے حق پیش کیا گیا تو انھوں نے یہی عذر پیش کیا۔

نہ اچھی باتوں کی قید لگانے سے بات بنتی ہے۔ یہ بات کہ تمام عالمِ انسانیت میں کچھ قدریں مشترک ہیں اور اچھی سمجھی جاتی ہیں، ایک تو اس لیے ہے کہ معاشرے کے قیام کے لیے کچھ افعال کو جرم قرار دینے کی مجبوری تھی اور بہت کچھ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ملّت کی طرف اپنے بشیر و نذیر بندے بھیجے جو وقتاً فوقتاً دینِ فطرت کی توضیح کرتے رہے ورنہ انسانی معاشروں میں اچھائی برائی کے معیار بہت مختلف رہے ہیں۔ انسانی معاشروں میں غلامی کو ایک مستحسن ادارہ سمجھا گیا ہے۔ عورتوں کو مردہ شوہروں کے ساتھ جلانے کو ایک بڑا کارِ ثواب سمجھا گیا اور آج بھی اچھائیوں اور برائیوں کے معیار میں بہت تفاوت ہے۔

خود عرب جاہلیہ ہی کو لو اس معاشرے میں قبائلی اہمیت کو، باہمی زینت و تفاخر کو، مال و اولاد کی کثرت کو، لذات و شہوات میں ارادانہ انہماک کو، تہور اور اسراف کو، کبھی نہ مٹنے والے جذبۂ انتقام کو، اپنے قبیلے کے بت کی عبادت اور حمایت کو اچھی باتیں سمجھا گیا ہے۔ وہ لوگ اس کو جوہرِ مردانگی یا مُروّۃ کہتے تھے۔ اور یہ صفات آج بھی کسی نہ کسی بھیس میں موجود ہیں، اور مستحسن سمجھی جاتی ہیں۔

مسلمانوں میں جو سلفِ صالحین کی تقلید کی تاکید چلی آرہی ہے اس کی سند قرآنِ حکیم میں یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک جگہ مہاجرین اور انصار ہیں جو ایمان میں سبقت کرنے والے ہیں ان کا ذکر کیا گیا اور پھر ان کا ذکر کیا گیا جو نیکی کے ساتھ ان کا اتباع کرتے ہیں اور ان سب کو اللہ کی خوشنودی میں شامل کیا گیا دوسری جگہ پھر مہاجرین و انصار کا ذکر کیا گیا اور پھر

ان کا ذکر ہے جو ان کے بعد آئے کہ وہ اپنے لیے اور اپنے بھائیوں کے لیے جنھوں نے ایمان میں ان سے سبقت کی، استغفار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، ان کے دل میں کینہ نہ رہے۔

زندگی کی اس روایت کی ابتدا سنتِ جاہلیہ کی بجائے سنتِ محمدیؐ کے قیام سے ہوتی ہے۔ سنّت طریقے کو کہتے ہیں۔ حضورؐ نے ملتِ مسلمہ کی تاسیس فرمائی۔ اسکی ایک نہج اور طریقہ مقرر فرمایا۔ اس نہج اور طریقے کو سنتِ محمدیؐ کہتے ہیں۔ سنتِ جاہلیہ کی کچھ خصوصیات اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنتِ محمدیؐ کی کچھ خصوصیات تسلیم و رضا، صبر، تفاخر سے نفرت، اللہ کی زمین پر خاکساری کے ساتھ چلنا، عدل و انصاف خواہ وہ اپنے خلاف کیوں نہ ہو عفو و درگزر غریبوں کی دستگیری، اقربا سے صلۂ رحم، سخاوت و جہاد فی سبیل اللہ اور توکل ہیں۔ یہ تقویٰ کا طریق ہے۔

سنتِ جاہلیہ اور سنتِ محمدیؐ کے مختصر اور نامکمل خاکے تمھارے سامنے ہیں۔ یہ زندگی کے دو متصادم اور متضاد معیاروں کی تعبیریں ہیں۔ یہ تضاد اور تصادم چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بولہبی میں ازل سے تا امروز چلتا رہا ہے۔ انھیں معیاروں کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کے تصورات ہیں۔ ہم اعتقاداً اور عقلاً اور علیٰ وجہ بصیرت اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا وہی معیار مطلق اور سیدھا سچا ہے جو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے قائم کیا۔ صراطِ مستقیم ایک ہی ہے۔ گمراہی کی راہیں ہزار ہیں۔ متنازعہ فیہ معاملات میں قولِ فیصل اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کا ہے اپنے بزرگوں کے ساتھ نیکی اور احسان اور احترام کا حکم ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دائرے میں۔

ہر امت کا ایک طریق ہوتا ہے، ایک سنت ہوتی ہے، ملّت کی زندگی میں سنت کا وہی مقام ہے جو فرد کی زندگی میں عادت اور سیرت کا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کی سنّت سنّتِ محمدی ہے۔ جس حد تک یہ سنت زندہ اور فعال ہے اس حد تک یہ ملّت کہلانے کی مستحق ہے۔ یہی سنّت مکانی اور زمانی اعتبار سے ملّتِ مسلمہ کی شیرازہ بند ہے۔ ایک مسلمان قوم کا دوسری مسلمان قوم سے رابطہ اور ایک مسلمان نسل کا دوسری مسلمان نسل سے سلسلہ بھی سنت ہے۔

بزرگوں کی تقلید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چند ظواہر میں بغیر سوچے سمجھے بزرگوں کی نقالی کی جائے اور اپنے تقاضوں اور مصلحتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اس معنی میں تقلید کا حکم کہیں قرآنِ حکیم میں نہیں آیا۔ بزرگوں کی تقلید کے مستحسن معنی بلا کم و کاست یہ ہیں کہ تغیّر پذیر زمانے میں ہم زندگی کی اس روایت کو عبادات کے ان طریقوں کو، معاملات میں ان قدروں کو قائم رکھیں جن کا آغاز حضورؐ سے ہوا اور جو بزرگوں سے ورثہ میں ہمیں ملی ہیں۔ ان کی فکر و نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ دیکھیں کہ ان کے لیے انسانی زندگی کی قدریں کیا تھیں تاکہ ان ظواہر کی کم بھی سمجھ میں آسکے ورنہ محض تقلیدی مماثلت ایسی ہی ہوگی جس طرح مثنوی معنوی کی ایک حکایت میں ایک طوطی جس کے سر کے بال ضرب کی وجہ سے اڑ گئے تھے ایک مُوتراشیدہ قلندر کو اپنا رفیق و ہمساز سمجھ بیٹھا تھا۔ زندگی کی روایت چند ظواہر کا میکانکی مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک نامیاتی وحدت ہے۔ وحدت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایک حصّہ کا دوسرے حصّہ سے تعلق محض خارجی تعلق نہیں ہے بلکہ اصل و فرع کا یا ایک ہی اصل کے مختلف فروع کا یا ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کا تعلق ہے، اور نامیاتی کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت منجمد یا ساکن نہیں ہے بلکہ زندہ اور متحرک اور فعال ہے۔ بزرگوں کی ایک سنّت یہ بھی تھی کہ وہ تفکّر اور تعقّل اور تدبر کے قرآنی فریضے یعنی اجتہاد سے غافل نہیں ہوئے۔

اندھی تقلید کا جہاں ایک بُرا اثر یہ ہے کہ انسان کے ذہن کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ تفکّر اور تعقّل سے عاری ہو جاتا ہے۔ وہاں تقلید پر زور دینے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ انسان اس عام ذہنی اور نفسانی وبا سے بچا رہتا ہے۔ جسے جدیدیت کہتے ہیں۔ جس کی علامتیں تو بہت سی ہیں مگر سبب یہ ہے کہ کسی قوم میں جب زندگی کم ہو جاتی ہے اور اس میں احساسِ کمتری شدید ہو جاتا ہے تو اس قوم کو دوسری قوموں کی ہر بات اچھی لگتی ہے، اور ہر تصوّر اور ہر طریقہ جو عام فیشن میں پسندیدہ سمجھا جاتا ہو اس میں اس کو ایک کشش محسوس ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی روایت کے معیار سے اِن طریقوں اور تصورات کی تنقید کرے ان طریقوں اور تصورات کے معیار سے اپنی روایت کی تنقید کرنے لگتا ہے اور پھر یا تو اپنی روایت سے دانستہ طور پر، فاخرانہ انداز میں لیکن بہت احمقانہ انحراف کرنے لگتا ہے۔ یا ان بے جوڑ طریقوں

اور تصوّرات کی بھی اپنی روایت میں پیوندکاری کی بہت مضحکہ خیز لیکن خطرناک کوشش کرتا ہے۔ یہ جدیدیت بدعت ہی کی ایک صورت ہے جو ملّی روایت یا سنّت کو مسخ کر دیتی ہے۔

روایت ایک محور کی طرح ہے جس کے چاروں طرف بدلتی ہوئی زندگی گردش کرتی ہے۔ اس روایت کا عمل ایک عمل انگیز CATALYST کا سا ہے جو بغیر خود بدلے ہوئے زندگی کے اس آمیزہ کو بدلتا ہے جس میں وہ روایت عمل کرتی ہے۔ زندگی میں نئے مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ نئی دریافتیں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے ادارے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ نئے اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ زندگی کی روایت بجائے خود ان میں پگھل کر ختم ہونے کے ان کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اپنا ایک حصہ بنا لیتی ہے۔ اس کو اصطلاحی زبان میں اجتہاد کہتے ہیں جس کی اوّلین شرائط اس روایت کی روح کو سمجھنا یعنی علم، اس روایت پر عمل یعنی تقویٰ، اپنے گردوپیش کے حالات ان کے رُخ، ان کی سمت، ان کی معنویت میں گہری نظر یعنی شعور اور ان دائمی اصول اور قدروں کو بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت یعنی حکمت سے بہرہ ور ہونا ہے اس طرح یہ بزرگوں کی روایت ایک درخت کی طرح بڑھتی ہے جو ہر حال میں وہی درخت رہتا ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط ہوں، جس کی شاخیں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھائی ہوئی ہوں اور جس سے ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں لوگ زندگی کی غذا حاصل کرتے رہیں۔

رسوم

اظہارِ مسرّت

اللہ تعالیٰ ہنساتا ہے اور رُلاتا ہے!

دنیا میں خوشی اور غم انسان کا مقدر ہے لیکن یہ دونوں کیفیات اور ان کیفیات کا اظہار اخلاقی تربیت کے مختلف مدارج پر مختلف ہوتا ہے، جو انسان اخلاقی تربیت کے پست ترین درجہ پر ہوتا ہے، وہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح ہے۔ اس کے لیے مسرت جذبات کی برانگیختگی اور اشتعال کا، اور غم جذبات میں پراگندگی اور انتشار کا نام ہے۔ اور دونوں کیفیتوں کا اظہار حیوانی اور ہیجانی اور مذبوحی حرکات سے ہوتا ہے۔ جنکا حوادثِ زمانہ سے آزاد ہونے کے لیے ایک ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انسان نہ خوشی سے متاثر ہو نہ غم سے، اسلام جذبات کی اس طرح تہذیب کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے اس میں اور کائنات میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر قبض و بسط کی کیفیات زندگی کے نغمہ کا زیر و بم بن جاتی ہیں۔ خوشی میں خوش بھی ہوتا ہے۔ غم میں غم بھی کرتا ہے، لیکن خوشی شکر کے ساتھ اور غم صبر کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح شکر خوشی کو زائل نہیں کرتا اسی طرح صبر غم کو زائل نہیں کرتا بلکہ شکر خوشی میں اور صبر غم میں ایک معنویت پیدا کر دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم بار بار انسان کو اپنی طرف اور اپنے اندر آفاق اور انفس پر نظر کرنے کی اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کائنات میں جو حسن و جمال ہے، اس میں جو نظام ہے اور کس طرح اس کو تسخیر کیا گیا ہے۔ اس کے تسویہ اور تناسب میں، اس کے فیضان اور افادیت میں، اس کے اختلاف و تنوع میں، اس کے جذب و اتصال میں، اس حق میں جس کے ساتھ اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان حکمتوں میں جو اس میں مضمر کی گئی ہیں، اس کی ملکوت میں غور و مشاہدہ سے انسان کے قلب و روح میں حق اور حسن اور احسان کے اثرات اتر کر اس کو کائنات سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور ایک انبساط کی کیفیت اس میں پیدا کرتے ہیں جس کا اظہار اس

معرفت میں ہوتا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا رب ہے اور رحمٰن ہے اور سزاوار حمد ہے۔ قلبِ انسان ہی کیا زمینوں میں اور آسمانوں میں جو شئے ہے اس کے رگ و پے میں تخلیق کی مسرت کی لہر دوڑ رہی ہے اور وہ خدا کی تسبیح کر رہی ہے، ہم اس تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے لیکن اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ۵

جس طرح اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی ہے اس کو زینت دی ہے، زمین کو سربلندی سے اور آسمان کو چراغوں سے، اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو زینت دے جس میں خودنمائی کا نہیں بلکہ خوشنمائی کا، تکبّر و تبختر کا نہیں بلکہ بہجت و سرور کا اظہار ہو۔ طیبات رزق کو اور اس زینت کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں منع کرنے والا کون ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ جب اس کے بندے عبادت کے لیے اس کے دربار میں حاضر ہوں تو زینت کے ساتھ آئیں، اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا میں جو چیزیں دی ہیں۔ ان کو مقصدِ حیات سمجھنا غلط ہے، لیکن وہ متاعِ حیاتِ دنیا تو ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی ہماری نگاہوں میں زینت دی ہے، بُری چیزوں کو، قبیح چیزوں کو، اور مکروہ چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے، وہ سیّات یا سوء ہوں، خواہ وہ لاش ہو جس کو قبر میں ڈھانپا جاتا ہے، یا ستر ہو جس کو لباس سے ڈھانپا جاتا ہے، یا نفسِ انسانی کی وہ عریانیاں ہوں جن کو تقویٰ کے لباس سے ڈھانپا جاتا ہے یَامَنْ اَظْهَرَ الْجَمِيْلَ وَسَتَرَ الْقَبِيْحَ۔

انسان کے روحانی ارتقاء کا بلند ترین درجہ جس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں تمام خوف و حزن و ملال، بغض و کینہ و حسد، جزع و فزع سے دور، خوشی و غم سے ماوریٰ ایک تبشیر و رجا، رضی اللہ اور رضوا عنہ کا ایسا مقام ہے جس کے اطمینان و سکون کو، سرور و انبساط کو سخت سے سخت امتحان اور بڑی سے بڑی مصیبت متزلزل نہیں کر سکتی۔

اسلامی معاشرے میں خلوت و جلوت کی خوشیوں کا علیحدہ مقام ہے۔ عورتوں کی زیبائش و آرائش ان کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ یہ عزیزوں اور محرموں میں مسرت کا اظہار ہے لیکن اس زینت کو غیروں کو دکھا کر اترانا اور خوش ہونا تبرّج الجاہلیۃ ہے۔ معاشرہ میں ہر فرد

دوسرے کی خلوت کا احترام کرتا ہے۔ دینِ اسلام کے نزدیک اظہارِ مسرت کے تمام وہ اسلوب جن میں خود پسندی اور اتراہٹ ہو، اپنی ڈینگ مارنے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش ہو، یا دوسروں کی تحقیر و تمسخر کا پہلو نکلتا ہو، یا جس میں فحش و بے حیائی یا فسق و فجور کا شائبہ ہو، یا جو محض حیوانی حرکات پر مشتمل ہو مذموم ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں آپس میں الفت اور اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔ حسد اور تنگ دلی نہیں ہوتی۔ احسان و عفو و صلح کا سلوک ہوتا ہے، اگر ایک شخص کسی کو سلام کرتا ہے تو دوسرا اس سے بہتر الفاظ میں اور اس سے زیادہ نیک دعاؤں سے اس کو جواب دیتا ہے۔ جب قلب قلب کا آئینہ ہوتا ہے تو ایک قلب کی خوشی تمام محفل میں آئینہ خانہ میں روشنی کا سماں باندھ دیتی ہے۔

عیدین کے موقع پر اظہارِ مسرت کے قرآنی اصول عملاً ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ پہلے تو مسرت کی تقریب کو دیکھو، ایک عید ایک مہینہ روزہ رکھنے کی عبادت اور دوسری عید حج بیت اللہ کی عبادت سے وابستہ ہے۔ فطرہ اپنے غریب بھائیوں کو اپنے ساتھ عید کی خوشی میں شریک کرنے کی تدبیر ہے، قربانی ایک بندہ کی اللہ کی راہ میں سب سے قیمتی ہدیہ پیش کرنے اور اللہ تعالیٰ کا اس کو قبول فرمانے کی یا بندہ کا اپنے عہد پورا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت و انعام نازل کرنے کی تمثیل اور اس کا ذکر ہے۔ خوشی کا محرک جذبہ کسی دشمن پر فتح نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخروئی ہے۔ مرکزی عمل عید کی خوشی میں نمازِ عید ہے کہ اللہ نے حمد کو نعمت سے اور نعمت کو شکر سے پیوستہ کیا ہے، پھر گھر کو اور بستی کو، کوچہ و بازار کو آراستہ کرنا، اور اچھے لباس پہننا اور عطر لگانا اور مزیدار کھانے پکانے اور آپس میں کھانا کھلانا اور دینا دلانا، اس آراستگی اور زیبائش میں استکبار کا کوئی پہلو نہیں بلکہ یہ عالمگیر خوشی میں شریک ہوتا ہے۔ اس دن مصافحے ہوتے ہیں، معانقے ہوتے ہیں، دل کی کدورتیں دور ہوتی ہیں اور انشراحِ قلب ہوتا ہے، اخوت کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اور اس خوشی میں سب چھوٹے بڑے مساوی درجہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ؎

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہِ سمندر کج نہاد و شہ دیہیم

اظہارِ مسرت کی مکمل معروضی تمثیل جنّت کا بیان ہے، جہاں کسی قسم کی لغو اور واہیات نہیں ہے، جہاں دلوں کی تنگیاں، اور حسد اور بغض نہیں جہاں حزن وملال نہیں، جہاں چہروں پر نعمتوں کی تازگی اور شگفتگی ہے اور چاروں طرف نور ہے۔ جہاں ہر طرح کی راحت اور خوشبو دار چیزیں ہیں، جہاں زیب وزینت کے زیورات ہیں، جہاں خوش جمال صحبتیں ہیں۔ جہاں زندگی ہے، زندگی کی افزائش ونمو ہے، حلاوت ہے، سرور ہے، جہاں باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جنّتٍ تجری من تحتِها الانہار، جہاں ایک دوسرے کو پیامِ سلامتی ہے اور جہاں قربِ الٰہی ہے۔

دعوٰھم فیھا سبحٰنک اللّٰھُمَّ وتحیّتھُم فیھا سلام و
آخرُ دعوٰھُم اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ ربِّ العٰلمین ۵

عید

ایک قوم یا ملّت کی اجتماعی روح کا اندازہ اس کے تہواروں اور تقریبوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اجتماعی تقریبات اجتماعی روح کا مظہر بھی ہوتی ہیں اور خود اس پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ مسلمانوں میں دو بڑی اجتماعی تقریبات مقرر ہیں۔ ان دو عیدوں میں ایک عید الاضحیٰ ہے۔ یہ تقریب حج کے اختتام پر منائی جاتی ہے۔ اور علامتی حیثیت سے اللہ کی راہ میں اپنی عزیز ترین شئے قربان کرنے کا عہد ہے۔ دوسری عید الفطر ہے جو ماہ صیام کے اختتام پر منائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہِ صیام کو تمام سال کے مہینوں پر عزّ و شرف، کرامت و فضیلت بخشی، اسی مہینہ میں قرآن اتارا جس میں بندوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے، اسی مہینہ میں لیلۃ القدر کو قرار دیا جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، بندوں پر اس مہینہ کے روزے فرض کیے اور ان کو اس بات کی توفیق دی کہ انھوں نے فرض کو پورا کیا۔ اور نعمتوں اور برکتوں سے بہرہ مند ہوئے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس طرح لفظِ اسلام کی نسبت کسی شخص سے نہیں ہے بلکہ عقیدہ اور عمل میں اللہ تعالیٰ کے حضور ایک خاص رجحان اور رویہ سے ہے اسی طرح مسلمانوں کی یہ عیدیں بھی کسی شخص کی پیدائش یا اس کے کارناموں اور اصلاحات سے یا اس کے حصولِ اقتدار و حکومت سے یا میدانِ جنگ میں اس کی فتوحات سے متعلق نہیں ہیں۔ عید الاضحیٰ جس واقعہ کی یادگار ہے اس کی اہمیت تاریخی بھی ہے اور اس سے زیادہ علامتی ہے۔ ایک بندہ کا تسلیم و رضا کے امتحان میں پورا اترنا جو روحِ اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس بندہ کو خلّت و امامت سے سرفراز کرنا۔ عید الفطر اللہ کا شکر ہے اس نعمت پر کہ اس نے اپنے بندوں کو عبادت کے طریقے سکھائے۔ ان عیدوں کا تعلق دو ارکان یعنی حج اور روزے سے ہے۔

عید کا مرکزی عمل نمازِ عید ہے۔ اس عبادت کا معاشرتی پہلو یہ ہے کہ تمام بستی کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ اس عبادت کو ادا کرتے ہیں۔ دن میں پانچ وقت اجتماع محلّہ کی مسجد میں ہوتا ہے۔ ہفتہ میں جمعہ کے روز اس سے بڑا اجتماع مسجدِ جامع میں ہوتا ہے۔ تمام بستی کے

مسلمانوں کا اجتماع سال میں دو مرتبہ عید کے موقع پر عید گاہ میں ہوتا ہے۔ نمازِ عید فرادیٰ یا اکیلے نہیں پڑھی جاتی۔ نہ صرف یہ کہ محمود اور ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور بندہ اور بندہ نواز کا فرق وقتی طور پر مٹ جاتا ہے، بلکہ یہ اس حقیقت کا اثبات ہے کہ قابلِ حمد یا محمود ذات اللہ کی ہے، باقی سب اس کے عبد اور ایاز ہیں۔ بندہ نواز ایک ہے، باقی سب بندے ہیں اور بندہ ہونے کی حیثیت سے سب کالے، گورے، اصفر و احمر ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب بھائی بھائی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین معاشرتی رشتہ کی بنیاد ایک اللہ کا بندہ ہونا ہے۔

نمازِ عید سے پہلے صدقہ فطر دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے معاشرہ میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو عید کی خوشی منانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ذی استطاعت لوگوں پر یہ فرض ہے کہ مقررہ مقدار میں اناج یا اس کی قیمت نماز ادا کرنے سے پہلے ان لوگوں کے حصّہ کے طور پر نکال دیں جو حاجت مند ہیں۔ اس لیے کہ عید کی خوشیاں تو ساتھ مل کر ہی منائی جاتی ہیں۔ عید کے دن کا یہ منظر کہ ہر عید گاہ کے اندر عطر میں بسے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے نمازیوں کا ہجوم اور عید گاہ کے باہر ایک فوج عورت اور بچے اور بوڑھے فقیروں کی اپاہجوں، ناداروں، جذامیوں کی ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے ہوئے اس کی منتظر ہو کہ اللہ کے پیارے کب اپنی نماز ختم کرتے ہیں تاکہ اپنی محتاجی اور معذوری کا مظاہرہ کر کے وہ ان سے کچھ خیرات وصول کر سکیں۔ عید کے خوشنما چہرے پر ایک کالک ہے۔ اور تکلیف کی بات یہ ہے کہ یہ منظر اپنے معاشرتی اور انفرادی ضمیر کے لیے ایک چیلنج، اور اپنے معاشرہ کے لیے ایک لعنت، اور اپنی عید کی خوشیوں پر ایک طنز سمجھ کر اس کو مٹانے کی کوشش کرنے کے، ہم اسکو ٹھنڈے دل سے قبول کر لیتے ہیں اور کچھ پیسے ان کی جھولی میں ڈال کر اپنے ضمیر کو بہلا کر سلا لیتے ہیں کہ ہم نے کوئی بڑا نیک کام کیا۔ کاش وہ دن بھی آئے جب صدقۂ فطر دینے والے سب ہوں اور لینے والا کوئی نہ ہو، مدد کے لیے بڑھنے والے ہاتھ ہوں، کسی کے سامنے پھیلنے والے ہاتھ نہ ہوں، اور جو رقم صدقہ اور خیرات کے طور پر نکالی جاتی ہے وہ اجتماعی طور پر اور زیادہ فلاح و بہبود کے کام میں آئے۔ مسکینوں کی صحیح معنی میں دستگیری ہو سکے اور ہمارے یتیم خانے گداگری کا فن سکھانے کی

اکیڈمی نہ رہیں۔ کاش کہ صدقۂ فطر کا یہ سبق کہ ہم اپنی خوشیوں میں اپنے غریب بھائیوں کو نہ بھولیں اور خوشیاں تو مل کر ہی منائی جا سکتی ہیں۔ ہماری زندگی کا رہنما اصول بن جائے۔

عید کی تیاریاں عید سے بہت دن پہلے شروع ہو جاتی ہیں۔ جس بازار میں جاؤ وہاں خرید و فروخت کی گہما گہمی نظر آتی ہے، عید کی رات تک یہی چہل پہل رہتی ہے۔ کپڑے، جوتے، پھل، مٹھائی، آرائش و زیبائش کی چیزوں کی دکانوں پر ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ تاجر بجائے اس کے کہ بکری زیادہ ہو رہی ہے تو قیمتیں کم کر دیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر منہ بولے دام مانگتے ہیں، اور کچھ چیزوں کی قیمتیں تو عید کے موقع پر جہاں تک پہنچ گئیں وہیں رک کر رہ جاتی ہیں۔ عید کا دن ملنے ملانے کا ہے، جو دوست اور عزیز نظروں سے دور ہوتے ہیں ان کو عید کارڈ کے ذریعہ یاد کیا جاتا ہے۔ اور ان کو اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ آنکھوں سے دور رہ کر ہمارے پیارے دل سے دور نہیں ہیں۔ ملنا ملانا نماز کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ عید کے دن مصافحے نہیں ہوتے معانقے ہوتے ہیں۔ گلے ملا جاتا ہے، سینہ سے سینہ ملایا جاتا ہے، گویا اشاراتی زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے دل بغض اور کینہ سے پاک ہیں اور محبت و آشتی سے بھرے ہوئے ہیں۔ عید گاہ میں گلے ملنے میں اپنے پرائے، دوست و اجنبی کی کوئی تمیز نہیں کی جاتی، جو بھی آس پاس موجود ہیں انھیں سے معانقہ ہو جائے۔ جتنے لوگ بھی اس روز مل سکیں اتنا ہی اچھا ہے۔ حضورؐ ایک راستہ سے عید گاہ تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے۔ گھر آنے کے بعد پھر عزیز اور دوستوں کے یہاں جانے میں اور سیوئیاں اور مٹھائی چکھنے اور عید کی مبارکباد دینے میں عید کا دن ختم ہوتا ہے۔ ہماری عید کی خوشی میں کوئی حد سے بڑھی ہوئی اخلاقی اعتبار سے مذموم حرکتیں نہیں ہوتیں۔ کوئی اوچھا پن یا سوقیانہ بات نہیں ہوتی، بہت صاف ستھری خوشی ہوتی ہے جس میں ایک وقار ایک ٹھیراؤ اور ایک اعتدال ہوتا ہے اس لیے کہ اسلام اخلاقی تربیت ہی کا نام ہے۔

انسانی زندگی میں خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی لگے رہتے ہیں۔ خوشیوں کے موقعوں پر وہ غم اور بھی دل پر قیامت ڈھاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک اخلاقی تربیت کی بات ہے کہ عید کی اجتماعی خوشی میں ہم اپنے ذاتی غموں کا اظہار نہ ہونے دیں۔ ہاں عید الفطر کی روح کو اچھی

طرح سمجھ لیں، صدقۂ فطر کو سمجھ لیں کہ اپنی خوشیوں کے موقع پر اپنے غریب بھائیوں کو نہیں بھولنا ہے، گلے ملنے کو سمجھ لیں کہ بلا طبقاتی امتیازات کے ہمارے دل بغض اور دشمنی سے پاک اور محبت سے بھرے ہوں۔ ساتھ مل کر نماز پڑھنے کو سمجھ لیں کہ ہم اپنے آپ کو اجتماعی فلاح و بہبود کے حصول کے لیے وقف کر دیں، ہمارے ملک میں وہ عید بھی آئے گی جب معاشرہ میں اتنے اونچ نیچ نہ ہوں کہ آدمی، آدمی کو انسان نہ سمجھے اور سب مل کر ملک و ملت کو فروغ دینے میں مصروف ہوں۔ حقیقت میں وہ عید آزاد قوم کی عید ہوگی۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

وداعِ رمضان

آج تمام عالمِ اسلامی میں مسلمانوں نے سالِ رواں کے رمضان کو وداع کیا۔ بہت ادب و احترام سے غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ۔ غم اس لیے کہ یہ برکتوں والا مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ خوشی اس لیے کہ حسبِ توفیق مسلمانوں نے اس کی حرمت کی رعایت اور اس کے حق کو پورا کیا۔ اسلامی کیلنڈر میں رمضان کا مہینہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام زمانوں اور وقتوں میں منتخب کیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل کیا، نور کو اتارا، دن میں روزے واجب کیے، راتوں کی عبادت کی طرف رغبت دلائی۔ اس مہینہ کو لیلۃ القدر کی بزرگی دی، وہ ایک رات ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینہ کی حدود کی نگہداشت کرنے والوں کے دلوں میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے، گناہوں میں کمی ہو جاتی ہے، نیکی اور احسان کا راستہ آسان ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک فوجی تربیتی کیمپ میں شریک ہونے کے بعد ایک سپاہی بہتر سپاہی بن جاتا ہے، اسی طرح رمضان کے روحانی تجربے میں ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر ایک مسلمان بہتر مسلمان بن جاتا ہے۔

حقیقت میں ماہِ رمضان مسلمانوں کی روحانی تربیت کا ایک عالمگیر کیمپ ہے، اس کیمپ میں ملتِ مسلمہ کی بنیادی وحدت عمل کی یک رنگی کے ذریعہ اجاگر ہوتی ہے۔ آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں کی گوناگوں برائیوں سے بچ کر حتیٰ کہ اللہ کے حکم سے حلال چیزوں سے بھی اجتناب کر کے تقویٰ کا ایک ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اپنے نفس کو کلیتہً امرِ الٰہی کے تابع کر کے ایک فرد تنظیم کے صحیح معنوں سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ ذلت اور تعیش سے دامن پاک کر کے انسانیت کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے جہاں سے اخوت اور مساوات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ خمارِ گندم ذرا کم ہوتا ہے تو انسان تھوڑا سا اپنی حیثیت کو سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا قولاً اور فعلاً شکر ادا کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ صدقات و فطرات اور انفاقِ مال کے ذریعہ

سے اپنے سماج میں مختلف ناہمواریوں کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ معاشی اور عمرانی عدل کی بنیادی اہمیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ غرض اس کی انسانیت میں ایک وسعت اور گہرائی، قلب میں ایک کشادگی، اللہ کا حکم سمجھ کر معاشرے سے برائیاں اور ظلم اور ناانصافیاں دور کرنے اور نیکیوں اور احسان کو جاری کرنے کے عزم میں مضبوطی، اور اس عزم کی بجاآوری میں جو فرمانِ خداوندی سے ہم آہنگ ہے۔ ہر قسم کی مصیبت کو بخوشی قبول کرنے کی صلاحیت۔ یہ ماہِ رمضان کے تحفے ہیں جو اسی حد تک لوگوں کو ملتے ہیں جس حد تک وہ اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت کریں۔ یہی روحانیت ہے۔ حقیقتوں کا شعور جس سے یقین ابھرتا ہے۔ اس یقین سے پیدا شدہ عزم۔ اس عزم کو پورا کرنے کے لیے ناقابلِ شکست صبر و استقلال۔ یہی روحانی طاقت ہے۔

اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ہر طاقت کی بنیاد روحانیت ہی ہے۔ روحانی طاقت موجود ہوتی ہے تو ایک قلیل گروہ کثیر جماعت پر غالب آجاتا ہے۔ اپنے سے دُوگنی بلکہ دس گُنی مادی طاقت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے کی صحیح بنیاد عدل و احسان ہے۔ اللہ نے عدل اور احسان کا حکم دیا ہے۔ عدل و احسان سے اتحاد و اخوت پیدا ہوتے ہیں۔ ہر فرد اس معاشرہ سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا ہے کہ اس کے بغیر اپنا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس معاشرہ کو قائم رکھنا، اس کو ترقی دینا، اس کی حفاظت کرنا، اس کی خاطر جینا اور اس کی خاطر مرنا بھی زندگی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ یہی جہاد ہے تو گویا ماہِ رمضان کی روحانی تربیت اپنے نفس کے تزکیہ کے لیے اور معاشرہ کی تعمیر و تحفظ کے لیے جہاد کی تیاری ہے۔ ماہ رمضان خدا کے بندے کو خدا کا سپاہی بناتا ہے۔

مسلمانوں کی خوشیاں اور عبادتیں صرف انفرادی ہی نہیں اجتماعی بھی ہیں۔ وہ اس لیے کہ دینِ اسلام فرد اور جماعت کے رشتہ پر بہت زور دیتا ہے۔ فرد معاشرہ کو بناتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرہ فرد کو بناتا ہے۔ جس طرح رمضان اجتماعی عبادت ہے اسی طرح عید اجتماعی خوشی کو کہتے ہیں۔ اجتماعی خوشی اس کو کہتے ہیں کہ معاشرہ کے تمام عناصر خوش ہوں، صحیح عید یہ ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد امن اور خیر سگالی کے ماحول میں اپنے

علم و حکمت

اقبال علم

کسی مفکر کے علم کے متعلق خیالات اور تصورات اس کے پورے فلسفۂ حیات کا ایک حصہ ہوتے ہیں، اور اسی تناظر میں ان کے معنی کا ادراک اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اقبالؒ کے فلسفہ میں بنیادی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ بنیادی حقیقت اپنے تشخص اور انفرادیت کے اعتبار سے خودی ہے اور اپنے عمل کے اعتبار سے حرکت ہے۔ "گلشنِ رازِ جدید" میں علم کی ماہیت کے متعلق ایک پرانے سوال کا نیا جواب دیتے ہوئے اقبالؒ بتاتے ہیں کہ حیاتِ پُر نفس ایک بیتاب موجوں کا بحرِ رواں ہے۔ جس نے شعور و آگہی کا کنارہ پیدا کیا ہے اور چونکہ شعور و آگہی کا کنارہ خود حیات کا پیدا کیا ہوا ہے اس لیے یہ کنارہ حیات کو محدود نہیں کرتا۔ اس شعور و آگہی کے ذریعہ زندگی جہان کو منوّر کرتی ہے اور اس کو آئین میں اسیر کر کے قابلِ تسخیر بنا دیتی ہے اور جہان کے ذریعہ زندگی اپنے آپ کو پہچانتی ہے۔ یہ جہان ہم سے آزاد بھی ہے اور وابستہ بھی ہے۔ ہماری دانش و نظر اس جہان میں نور و صدا ہے اور ہر شئے موجود اور مشہود ہے، اور اس میں ایک آئین و نظام قائم ہے، اور یہ جہان ہمیں اپنی معرفت حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے اور کثرت میں احد کا جلوہ ممکن کر دیتا ہے اور پیراہنِ یوسف بن کر کنعان میں مصر کی خوشبو پہنچا دیتا ہے۔ گویا علم ہمارے اور حیات و خودی اور جہان کے مابین ایک تعلق کو کہتے ہیں۔ شعور و آگہی کے ذریعہ جہان شناسی اور جہان کے مقابلہ میں اور جہان کے ذریعہ خود شناسی کا نام علم ہے۔

یہ علامہ اقبالؒ کے مطابق علم کی ماہیت ہوئی۔ اب علم کے ماخذ کیا اور اس کا مقصد کیا ہے، کلامِ پاک میں علم کے تین ماخذ بتائے گئے ہیں۔ سمع، بصر، افئدہ۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں بلکہ اس کو اسلامی کلچر کی ایک اہم خصوصیت بتاتے ہیں کہ اسلام میں علم کی بنیاد حسّی ہے۔ گویا استقرائی طریق دریافتِ حقیقت اور مشاہدہ

اور تجربہ کی ضرورت اور اہمیت اور ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کی طرف اثباتی رویّہ وہ انقلابی قدم ہے جس کی وجہ سے زمانۂ حال کے سائنسی اور تاریخی علوم ممکن ہوئے۔ اس سے ایک طرف یونانی معقولیت کی اور دوسری طرف متصوفانہ رہبانیت کی تردید ہوئی ہے۔ کلامِ پاک میں فطرت کے مظاہر اور تغیرات کو آیاتِ الٰہی بتایا گیا ہے اور تاریخ کو قانونِ الٰہی کی کارفرمائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور مادّہ اور روح کی دوئی کی نفی کی گئی ہے لیکن جہاں علم کے ماخذ سمع اور بصر ہیں وہاں علم کا ماخذ افئدہ یعنی دل اور قلب بھی بتایا گیا ہے۔ اقبالؔ کی اصطلاح میں یہ عشق ہے اور عشق زندگی کا بنیادی جذبہ ہے، یہ جذبہ نمود اور نمو کا ہے، جہاں زندگی ہے وہاں یہ جذبہ بھی ہے۔ زندگی ہر حال میں اور ہر درجے میں اپنی نمود اور نمو کی تخلیقی تڑپ رکھتی ہے۔ حواس اور عقل سب اس سے ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں، یہ تو وہ ہتھیار ہیں جن کو زندگی نے اپنے مقاصد پورا کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جہاں عالمِ آفاق کا ذکر ہے وہاں عالمِ انفس کا بھی ذکر ہے، جس طرح وہ علم جس کا تعلق حس سے نہ ہو بے اصل ہے۔ اسی طرح وہ علم جس کے ساتھ سوزِ دل شامل نہ ہو گم کردہ راہ ہے۔

اقبالؔ نے مغرب کے علومِ حاضرہ پر جو تنقید کی ہے اس کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ گو یہ علوم مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہیں اور عقل کی حیرت انگیز وسعت اور رسائی کی دلیل ہیں لیکن اس میں سوزِ دل یا عشق موجود نہیں ہے اور اس سے جو نتیجہ پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ اوّل تو ان علوم کا کوئی مقصدِ اعلیٰ سوائے دولت اور طاقت کے حصول کے نہیں ہے۔ اور یہ انسانی ذہن میں انتشار پیدا کرنے کا باعث ہو گئے۔ دوسرے ان علوم کے نتیجہ میں حیرت انگیز مشینیں تو پیدا ہو گئیں لیکن روح مردہ ہوتی چلی گئی۔ ستاروں کی گذرگاہوں تک پہنچنے والا انسان اپنی شبِ تار کو سحر نہ کر سکا۔ اور تیسرے ان علوم سے جو طاقت حاصل ہوئی اس کا نتیجہ دنیا میں ہر طرح کا فساد پیدا ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا۔

مگر علم عشق کے ساتھ ہے تو وہ نور ہے، اگر عشق سے قطعِ تعلق کر لیا تو وہ نار ہے، اگر علم کے اندر عشق کا دردِ دل پیدا ہو جائے تو آسمان کے نیچے بہشتِ جاوداں کی تعمیر

ممکن ہے۔ علم کا اگر عشق سے واسطہ نہیں ہوتا تو وہ سحرِ سامری اور افسونگری سے زیادہ کچھ نہیں۔ علم اگر سوزِ دل کے بغیر ہے تو وہ شر ہے، اس کا نور بحر و بر کی تاریکی ہے۔ علم کو اگر تن یا بدن کی خواہشات اور شہوات کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سانپ ہے۔ علم کو اگر دل کے تقاضوں اور مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں۔ اگر علم اور عشق کا ساتھ ہے تو علم خود ہی اپنا راستہ ہے اور خود ہی اپنا رہبر ہے اور خود ہی اپنے بتوں کا ابراہیمؑ ہے۔

علم کا تعلق اگر سوزِ دل سے ہے تو اوّل تو عقل اور علم کے لیے ایک مقصد پیدا ہو جاتا ہے، عقل اپنے حدود میں بڑے حیرت انگیز طور پر زندگی کی خدمت کرتی ہے۔ لیکن اپنے حدود سے تجاوز کر کے بڑے فساد پیدا کرنے والی ایک طاغوتی طاقت بن جاتی ہے۔ اقبالؔ کے مطابق عقل خود اپنا مقصد متعین نہیں کرتی بلکہ مقصد عشق مقرر کرتا ہے، فکر جستجو کرتی ہے لیکن بے منزل ہے۔ عشق ہستی و عدم سے آگاہ کرتا ہے اور بُت خانۂ عقل کو حرم بناتا ہے۔ دوسرے علم جس کے لیے شک ضروری ہے، عشق سے آمیز ہو کر یقین پیدا کرتا ہے اور بغیر یقین کے عمل ممکن نہیں ہے۔ تیسرے عشق ہی کی آمیزش سے علم میں حرارتِ عمل پیدا ہوتی ہے، تسخیرِ کائنات کے بعد فساد فی الارض کا نہیں بلکہ نیابتِ الٰہی کا درجہ آجاتا ہے۔ اور عشق جو مقصد سامنے رکھتا ہے وہ توحید ہے، اسی سے علمِ اشیاء، علم اسماء بن جاتا ہے، اور انسانی ارتقار کا وہ راستہ کھل جاتا ہے جس کا بیان ممکن نہیں اور جس کا منتہا خود اللہ تعالیٰ ہے۔ ؎

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور

علم کی ماہیت اور علم کے ماخذ و مقصد کے بعد علامہ اقبالؔ ہمیں تنبیہ کرتے ہیں کہ علومِ حاضرہ سے ہمیں آنکھیں بند نہیں کرنی ہیں لیکن اس کی بھیک مانگ کر اس کا غلام بھی نہیں بننا، بلکہ اس کی کوتاہی اور نارسی اور تباہ کن داخلی اور خارجی اثرات اور عواقب پر ایک گہری نظر تنقیدی نظر رکھنی ہے، اور اس تنقید کا معیار خود ہماری خودی کی پختگی

اور بیداری ہے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم اپنی زندہ روایات سے تعلق رکھیں۔ ام الکتاب کی حکمت کے امین اور وارث بنیں، علم کو روٹی کے بدلے نہ بیچیں، احرار کی صحبت اختیار کریں، سب سے بڑھ کر عشقِ رسولؐ کی شمع کو دل کے ایوان میں روشن رکھیں تاکہ علم و حکمت سے ایک نئی دنیا پیدا کر سکیں۔

طالبِ علم

دینِ اسلام کی رو سے تو ہر شخص عمر کے ہر حصّہ میں طالبِ علم ہی ہے۔ خود دینِ اسلام سرتاسر علم اور معرفت ہے، اسلام کی تعلیم سے پہلے عہد کو عہدِ جاہلیت کہا جاتا ہے۔ کفر کی توجیہ اور عذر ہی یہ ہے کہ کافر کو علم نہیں ہوتا۔ ہر مرد اور ہر عورت کے لیے علم حاصل کرنا فرض ہے گویا اگر علم حاصل نہیں کرتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو وہ گناہ کر رہا ہے جس کا ذمہ دار وہ شخص بھی ہے جو اس کو اس فرض کی طرف راغب کر سکتا تھا اور اس نے نہیں کیا۔

آج کل مسلسل تعلیم اور ناحیات تعلیم کے تصوّرات اور اصطلاحات بہت زیادہ رائج ہیں لیکن کیا اس تصور کے اظہار کے لیے کوئی طریقِ اظہار اس سے بلیغ تر ہو سکتا ہے کہ علم تہد سے لحد تک یعنی جھولے سے ابتدا کر کے قبر تک حاصل کرو۔ علم کے حصول میں ملکی یا نسلی حدیں حائل نہیں ہوتیں چنانچہ کہا گیا ہے کہ علم کی طلب میں دور و دراز ملکوں تک یہاں تک کہ چین تک جاؤ۔ طلبِ علم میں گھر سے نکلنا جہاد ہے۔ کہا گیا ہے کہ حکمت مومن کا مال ہے جہاں بھی ملے اُسے حاصل کرو۔ ہمارا رسولؐ خود علم کا مدینہ تھا، اس بات کی دعا مانگتا تھا کہ یا اللہ میرے علم میں ترقی دے۔ بار بار کلامِ الٰہی میں اس بات کی تاکید ہے کہ آیاتِ الٰہی میں تفکّر اور تعقل اور، تدبّر کرو، اور اس کائنات کے تمام مظاہر اور تمام شواہد آیاتِ الٰہی ہی ہیں، کہا گیا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ اور سننے والا کان اور سمجھنے والا قلب پیدا کرو، اس لیے کہ زندگی یہی ہے، جہالت موت ہے۔ اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ زمین آسمان میں جو کچھ ہے اسے انسان کے لیے مسخّر کیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں سے بیّن طور پر جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۲) علم حاصل کرنا فرض ہے، اور جہالت اپنے فرض سے غفلت ہے، اور اپنے فرض سے غفلت گناہ ہے۔

۲۔ انسان کو قلیل علم دیا گیا ہے۔ علم ذات اللہ کی ہے۔ علم میں کامل ہونے کا دعویٰ کسی انسان کو سزاوار نہیں۔ طلبِ علم ہی انسان کا شرف اور اس کا مقدر ہے۔

۳۔ علم کی کوئی حد نہیں ہے۔ علم لامتناہی ہے۔ یہ وہ سفر ہے کہ جتنے بڑھتے جاؤ گے اتنے ہی نئے افق پیدا ہوتے جائیں گے۔

۴۔ علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں، بچے، جوان، بوڑھے، سب علم حاصل کرنے پر مامور ہیں، تحصیلِ علم کی مدت تمام عمر ہے، اور تحصیلِ علم مسلسل عمل ہے۔

۵۔ علم حاصل کرنے کے لیے ہر مشقت برداشت کرنا ثواب ہے، اور علم حاصل کرنے کے لیے یہ مت دیکھو کہ کس سے اور کہاں سے علم حاصل کر رہے ہو، ہر جگہ سے علم حاصل کر کے اسے اپنی حکمت میں ڈھالو۔

۶۔ تحصیلِ علم ہی سے انسان انسان بنتا ہے، علم زندگی ہے، جہالت موت ہے، علم ہی سے انسان کائنات کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔ کائنات کے راز و رموز سے واقف ہو کر ہی کائنات کی تسخیر ممکن ہے۔ علم ہی سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے کہ

"بے علم نتواں خدا را"

شناخت، خلافتِ الٰہی کی شرط علم ہی ہے، غرض کہ اس فسانۂ آب و گِل کا مرکزی کردار علم ہے اور اس کے بغیر نہ تو انسان کو دوسری مخلوقات پر شرف حاصل ہے اور نہ ہی وہ اپنی غرضِ تخلیق کو پورا کرتا ہے۔ قرآنِ مجید نے واشگاف الفاظ میں ذہنِ انسانی سے یہ سوال کیا ہے کہ "کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟" کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا نور اور ظلمت برابر ہو سکتے ہیں، اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی ذات سے سوال کر کے اس فطری نتیجہ تک پہونچ جائے کہ علم نور ہے اور جہالت تاریکی ہے، عالم بینا ہے اور جاہل اندھا ہے اور ان دونوں طبقوں کو مراتبِ انسانیت میں یکساں اور برابر کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو تحصیلِ علم میں صرف کرے۔

تحصیلِ علم ایک مثلث ہے جس کے زاویے استاد، شاگرد اور موضوع ہیں، ان

تینوں زاویوں میں سے اگر ایک بھی مفقود ہو تو تحصیلِ علم ناممکن ہو گی، موضوع وہ علم ہے جسے شاگرد حاصل کرنا چاہتا ہے اور استاد اس کا ابلاغ کرتا ہے اس لیے تحصیلِ علم کے لیے بنیادی طور پر استاد اور شاگرد میں ایک خوش گوار ربط کا ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے استاد اور شاگرد دونوں کے فرائض اور حدود معین کر دیئے ہیں تاکہ انسانی معاشرے میں ایک صحت مند علمی فضا پیدا ہو سکے، استاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ شاگرد سے نرم لہجہ میں گفتگو کرے، مفہوم کو سمجھانے کے لیے صاف اور آسان مثالیں پیش کرے اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اگر دلیلیں دے تو ایسی، جو آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ قرآنِ حکیم نے دنیا کے سب سے بڑے استاد اور معلم خلقی مرتبت کی نسبت سے ضابطۂ اخلاق بتایا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اگر تم لوگوں سے سختی اور درشتی سے پیش آتے تو لوگ تم سے روگردانی کر لیتے، اگر بحث کرو تو احسن طریقے سے کرو اور مثالوں کے ذریعے اپنی بات کو واضح کرو۔

اسی طرح استاد کا فریضہ فقط علمِ دنیا ہی نہیں ہے بلکہ ذہنی کی تربیت بھی ہے تاکہ شاگرد ایک اچھا شہری اور اچھا انسان بن سکے۔ قرآنِ مجید نے اسی بات کو تزکیہ کی جامع اصطلاح استعمال کر کے پہنچایا ہے اور یہ کہا ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دینے سے قبل نفسِ انسانی کا تزکیہ ضروری ہے، اور ایک اچھے استاد کی شان یہ ہے کہ جس علم کی تدریس کر رہا ہو اپنے شاگردوں میں اس علم کا ذوق پیدا کر دے، یہ ایک اچھے استاد کے فرائض ہیں، اور شاگرد کے فرائض یہ ہیں کہ استاد کو احترام کی اس حد تک سمجھے جیسے اپنے باپ کو سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ جس نے تمھیں تعلیم دی وہ بھی تمھارا باپ ہے۔

اور علم کو کسی تجارت یا دوسرے مقصد کے لیے حاصل نہ کرے بلکہ خود علم کو مقصد بنائے۔ تحصیلِ علم کے دوران استاد اور شاگرد کے درمیان جو سب سے بڑا رشتہ ہے وہ ادب کا رشتہ ہے، اس کے لیے حدیث میں بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ استاد کا ادب دنیا و آخرت کی کامیابی کی کنجی ہے۔ فطری طور پر یہ رشتہ باہمی محبت اور ذہنی سمجھوتہ کو استوار کرتا ہے جس کی وجہ سے تحصیلِ علم کی فضا خوشگوار ہو جاتی ہے۔

لیکن استاد کا ادب کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شاگرد اپنے دل میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا اظہار بھی نہ کرے۔ ادب کا یہ تصوّر انتہائی ناقص ہے صحیح تصوّر یہ ہے کہ شاگرد استاد کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ہر شبہ کو استاد کے سامنے پیش کرے اور دل میں پیدا ہونے والے ہر سوال کو اس سے پوچھ لے اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ذہن و فکر میں صفائی پیدا ہوگی۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ استاد کو طالبِ علم کی سطحِ فکر کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اس سے قریب تر ہونے کا موقع ملے گا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علم شرافتِ آدم کی دلیل اور تقدسِ انسانیت کا نقطۂ امتیاز ہے اور اُس کی طلب فرزندِ آدم کی میراث ہے لیکن اس کی تحصیل کے آداب معیّن کر دیئے گئے ہیں، کہ ذہنِ انسانی بے راہ روی کا شکار نہ ہو جائے اور منزل راستوں ہی میں گم ہو کر نہ رہ جائے، اور استاد و شاگرد کا رشتہ ایسا مستحکم اور نہ ٹوٹنے والا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے درہم و برہم نہیں کر سکتی۔

دعوتِ تبلیغ میں حکمت کا تصوّر

عنوان میں جس آیت کی طرف اشارہ ہے اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دے اور ان سے جب بحث کرے تو اس طریقہ سے کر جو سب سے اچھا ہو۔

سبیل ربّک ۔ یا تیرے رب کا راستہ بلیغ اصطلاح ہے۔ راستہ میں ایک تو منزل کا یقین ہوتا ہے، ایک سمت ہوتی ہے، اور پھر چلنا ہوتا ہے اس لیے جس سمت میں کوئی چل رہا ہے وہی اس کا راستہ ہے۔ منزل تو رب ہے اس لیے کہ رب کا راستہ ہے منتہیٰ اللہ ہے، سمت عقیدہ ہے اور چلنا عمل۔ گویا تبلیغ عقیدے اور عمل کی ایک نہج پر لوگوں کو بلانا ہے۔ ظاہر ہے کہ دعوت دینے والا یا داعی وہی ہو سکتا ہے جو خود صحیح سمت میں چل رہا ہو، اور دعوت مؤثر اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ راستہ واضح ہو۔ یہ بات بحث یا مناظروں یا کتاب کے معنی میں عالمانہ تقریروں اور موشگافیوں سے بہت وسیع ہے۔ مناظرہ یا مجادلہ تو مذکورۂ بالا آیت کا تیسرا حصہ ہے۔ اللہ کے راستے کی دعوت تو پوری کتاب کے نازل ہونے سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ سبیلِ رب کی طرف دعوت تو اُس وقت شروع ہو گئی تھی جب اس راستے کے رہنما اور رہبر کو اپنے اللہ کا حکم پہنچا، جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے وہ پوری کتاب کو پڑھ کر مسلمان نہیں ہوئے بلکہ اس ہادی کو دیکھ کر مسلمان ہوئے جس پر ہدایت نازل ہو رہی تھی، اور بعد میں لوگ جوق در جوق دین اللہ میں اس لیے داخل ہوئے کہ ان کے سامنے اللہ کا راستہ واضح تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے ظلم و جہل کی تاریکیوں میں سے عدل و احسان علم و عمل کی روشن دنیا کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اللہ کا وعدہ محض وعدۂ فردا بھی نہیں تھا بلکہ ایک موجودہ حقیقت تھا۔ لوگوں کے جان و جہان پر اللہ کی رحمتیں اسی طرح نازل ہو رہی تھیں جس طرح آسمان سے مینہ نازل ہوتا ہے۔

حکمت کا لفظ کلامِ پاک میں بہت جگہ آیا ہے۔ پچھلے پیغمبروں کی امت پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان پر کتاب و حکمت نازل کی گئی۔ آلِ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و حکمت دی اور ملک عظیم دیا۔ اللہ تعالیٰ جسے مناسب سمجھتا ہے حکمت دیتا ہے۔ اور جسے حکمت دی گئی اسے خیرِ کثیر سے نوازا گیا۔ قرآن۔ قرآنِ حکیم ہے، حکمتِ بالغہ ہے، انتہائی حکمت ہے، حضورؐ کی بعثت کا مقصد قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ آپؐ آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب فرماتے تھے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ اس مقام پر تلاوتِ آیات اور علم کتاب کے اندر ایک فرق کیا گیا ہے۔ ہدایت عینِ کتاب بھی ہے، جزوِ کتاب بھی ہے، اور کتاب کی مظہر بھی ہے، آیات و کتاب میں وہ تعلق بھی ہے جو جزو کل میں ہے، وہ تعلق بھی ہے جو جسم اور روح میں ہے۔ میں اس بات کو یہیں چھوڑتا ہوں مبادا یہ بات آگے بڑھ کر مسلمانوں میں علمِ کلام کے ایک تاریخی اور نزاعی مسئلہ کی صورت اختیار کرے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ علمِ کتاب ان حقیقتوں کا علم ہے، ان کلماتِ الٰہی کا علم ہے جو ثابت و قدیم ہیں، جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، اور جو اگر سات سمندر سیاہی بن جائیں تو بھی احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتے" اور وہ علم ہے جو آیاتِ قرآنی کی لِم اور معنی ہے اور جس کی طرف آیاتِ قرآنی رہنمائی کرتی ہیں، اور جس کے حصول کی اولین شرط تزکیۂ نفس اور طہارتِ قلب ہے۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔

حکمت کے مختلف سیاق و سباق میں مختلف معنی کیے گئے ہیں لیکن ان کا دو شقوں میں احصار کیا جاسکتا ہے۔ ایک معنی تو عقل اور تجربہ کے ذریعہ سے اشیاء اور موجودات کی معرفت حاصل کرنا جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں۔ کتاب کی نسبت سے حکمت میں حقائقِ قرآن بھی آگئے۔ قرآنی اجمال کا بیان اور تفصیل اور تفسیر بھی آگئی۔ مواعظِ قرآن بھی اس میں شامل ہیں عقلاً عقائدِ اسلام کی تحقیق اور تجربہ کے اعتبار سے تزکیۂ نفس اور ارتقاءِ روحانی بھی حکمت کی شقیں ہیں، اور انھیں معنوں سے متعلق دوسرے معنی حکمت کے وہ فہم و دانائی ہے جس کے ذریعہ سے انسان علم کی روشنی میں مخصوص مسئلوں اور حقیقتوں کے متعلق صحیح اور غلط، حق اور باطل کا فیصلہ کرسکے۔ عملی زندگی میں ہر انسان کو فیصلہ تو ہر قدم پر کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص حکمت سے

بہرہ ور نہیں ہوتا، اس کے فیصلے کوتاہ بینی اور وقتی مفاد کے تابع ہوتے ہیں اور وہ اپنی چالاکی کو دانائی سمجھتا ہے، جو شخص حکمت سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کے فیصلے علم اور اصول کی روشنی میں ہوتے ہیں اور وہ محکم ہوتے ہیں۔ علم کتاب و حکمت میں حکمت کے معنی علم کتاب کا زندگی کے پیش آیندہ تمام مسائل میں مناسب مصرف اور اطلاق ہوئے۔ علم خبر ہے، حکمت نظر ہے۔

مذکورۂ بالا آیت میں دعوت الی سبیل اللہ کے تین طریقے بتائے گئے ہیں۔ حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلۂ حسنہ، پہلا مفروضہ تو یہی ہے کہ اللہ کے راستہ کو واضح اور روشن کرنے کے لیے انتہائی سعی و کوشش کی جائے، کیونکہ اس کے بغیر دعوت میں جان نہیں پڑتی۔ دوسرا یہ ہے کہ داعی یا مبلغ صاحبِ علم و حکمت ہو، صاحبِ خبر اور صاحبِ نظر ہو، اس لیے کہ دعوت کی سب سے بڑی دلیل ناقابلِ تردید حجت خود داعی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اندر یقین اللہ والوں کو دیکھ کر ہوتا ہے، ہمیشہ یہی ہوا ہے اور یہی ہوگا۔ کسی حقیقت کے ابلاغ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے زیادہ نقصان اس وقت ہوتا ہے جب مبلغ خود علم و اخلاق سے عاری ہو۔ قرآنِ حکیم میں یہودی علماء کو بھی مخاطب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کو تو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے کرتوت پر نظر نہیں کرتے۔ پھر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مخاطب کے عقل و شعور کے مطابق بات کرو، پیمبروں کا یہی شیوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی تو اپنے بندوں سے ان کے عقل و شعور اور تجربہ کے مطابق کلام کرتا ہے۔ اگر وہ ہماری سطح پر ہم سے بات نہ کرے تو اپنی بات ہمیں کیسے سمجھائے۔ مخاطب کے معتقدات و مسلمات کو اپنے سامنے رکھو۔ دیکھو قرآن حکیم میں منکرین سے کس طرح خطاب کیا گیا ہے، مشرکین سے کس طرح اور اہلِ کتاب سے کس طرح خطاب کیا گیا ہے۔ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ فرق قرآنِ حکیم کے ہر پڑھنے والے پر واضح ہے جو شخص ایمان لے آیا ہے اس کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم اس طرح ہے۔ اور اب اس کو عمل کے ذریعہ اس حکم کی تصدیق کرنا ہے، لیکن جو شخص ایمان نہیں لایا ہے اس کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ اسلامی عقائد کی حقیقت اور اسلامی احکام کی حکمت اس پر واضح کی جائے۔ قرآنِ حکیم میں ہر جگہ

تفکر اور تعقل کی دعوت دی گئی ہے۔ آفاق اور انفس میں جو اللہ کی نشانیاں ہیں جو حقیقتیں سب کے سامنے ہیں ان کے دیکھنے اور سننے کے لیے آنکھیں اور کان کھولے گئے ہیں۔ سمجھنے کیلئے قلب کو زندہ کیا گیا ہے، یہ موت اور زندگی، دن اور رات کا تغیر، یہ کائنات اس کی تعمیر، اس کا حسن، اس کا تناسب و اعتدال، اس کا ربط و امتزاج، اس کی ربوبیت اور فیضان، قوموں کا عروج و زوال، انسانی تعلقات اور رشتے، غرض ہر چیز میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ حقیقتوں کو منطقی دلیلوں کے طور پر نہیں بلکہ آیاتِ الٰہی کے طور پر پیش کیا ہے۔ منطقی دلیلوں میں بحث کی بہت گنجائش ہے، لیکن آیاتِ الٰہی سے انکار کس طرح ممکن ہے۔ عقائد کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے حضورؐ کا اسوۂ حسنہ پیش کر کے اسلامی عبادات و معاملات کی حکمت سمجھائی ہے اور دلیل و براہین کے طور پر یہ حقیقت واشگاف کرنی ہے کہ ان عبادات و معاملات کے ذریعہ صدرِ اسلام میں کیسی شخصیتیں تعمیر ہوئیں اور کیسا معاشرہ ظہور پذیر ہوا اور اس نے انسانیت کی تہذیب و تربیت میں کیا کردار ادا کیا۔

حکمت کے ساتھ ساتھ موعظۂ حسنہ ہے، حکمت میں جہاں عقل سے خطاب ہے وہاں موعظۂ حسنہ میں دل پر اثر ڈالا جاتا ہے۔ بدی کے انجام سے ڈرانا، نیکو کاروں کو بشارت دینا، انسانوں میں محبت کا رشتہ جوڑنا، گناہوں کے مارے انسان کو توبہ کا دروازہ دکھانا اور رحمتِ الٰہی کا امیدوار بنانا۔ غرض احکامِ اسلامی کی تعلیم تمام موعظۂ حسنہ میں داخل ہے۔

طالبِ حق کے لیے حکمت اور موعظۂ حسنہ کافی ہیں لیکن جو معاندانہ طور پر کٹ حجتی پر اتر آئے اس کے لیے صبر اور برداشت اور نیکی کرنے کی ہدایت ہے، اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں، برائی کا اس طریقہ سے مقابلہ کرو جو اچھا ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو وہ شخص جس کے اور تمھارے مابین عداوت تھی تمھارا دلی دوست بن جائے گا۔ لیکن یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جس میں صبر ہو اور جس کو نیکی سے بڑا حصہ ملا ہو۔

بابِ علم

کہا گیا ہے کہ دنیا میں دو کام مفید اور بامعنی ہیں، تعلیم و تعلّم، باقی کام فضول اور عبث ہیں۔ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ دنیا میں لوگ تین قسم کے ہیں۔ ایک عالمِ ربّانی، دوسرے نجات کے راستہ کے طالبِ علم اور تیسرے کمزور و فضول اشخاص جو ہر چیخنے والے کے پیچھے اور ہر ہوا کے ساتھ ہیں۔ جناب امیرؑ کا مقام بحیثیت استاد سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ بحیثیت طالبِ علم آپ کے مقام کا اندازہ کیا جائے۔ دنیا کے سب سے بڑے معلّم محمد مصطفےٰؐ کی مثال ایک آفتاب کی سی تھی، آفتاب سے ہر شئے بقدرِ ظرف و صلاحیت اکتسابِ نور کرتی ہے۔ اِلّا وہ اشیاء جو اس صلاحیت سے عاری ہیں۔ حضرتِ علیؑ نے اپنے ظرف و صلاحیت کی وجہ سے اور حضورؐ سے قرابتِ قریبہ کی وجہ سے ایسا اکتسابِ فیض کیا کہ اگر حضورؐ مثالی استاد تھے تو حضرت علیؑ مثالی شاگرد۔ حضرتِ علیؑ نے اپنے ایک خطبہ میں جو "خطبۂ قاصعہ" کے نام سے مشہور ہے، فرمایا:

> "آنحضرتؐ نے عہدِ طفولیت میں مجھے اپنی گود میں پرورش فرمایا، اپنے سینۂ مبارک سے مجھے لپٹایا .. .. میں حضرت کے پیچھے پیچھے یوں چلتا تھا جیسے بچۂ شتر اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے .. .. میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت و پیغمبری کی خوشبو سونگھتا تھا۔"

استاد کی شاگرد کو تربیت دینے کی تمثیل بچۂ شتر اور اس کی ماں کے تعلق سے بہتر اور شاگرد کے اکتسابِ فیض کی تمثیل اپنے استاد کے رنگ و بو کی معرفت اخذ کرنے سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ایک اور موقع پر جناب امیرؑ نے فرمایا:

> "قسم ہے اس کی جو دانہ کو شگافتہ کر کے درخت اُگاتا ہے اور جو جان کو پیدا کرتا ہے، قرآن کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں لیکن قرآن کو سمجھنے کی قوت، اور یہ دولت جس کو خدا چاہے دے۔"

گویا علم حاصل کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے دانہ سے درخت اُگنا یا جسم میں جان پیدا ہونا۔ درس گاہِ نبوت کے تربیت یافتہ اس شاگرد کو اپنے استاذ کا یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہوا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ دروازہ کے ذریعہ ہی سے مسافر شہر تک پہنچتا ہے، دروازہ ہی کے ذریعہ شہر کے فیوض و برکات دنیا میں شائع ہوتے ہیں۔

جناب امیرؑ کے خطبات و توقیعات و امثال و اقوال کا ایک مجموعہ "نہج البلاغہ" کے نام سے عام طور پر دستیاب ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب میں زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں نہ لیا گیا ہو۔ اس میں الٰہیات ہے، جس کے متعلق علامہ ابنِ ابی الحدید کا کہنا ہے کہ:

> "علیؑ کا یہی احسان کیا کم ہے کہ آپ نے توحید کے وہ تصورات بخشش فرمائے جن سے ہم ناآشنا تھے۔ اس میں کلامِ پاک کی آیات کی تفسیر اس شخص کی کی ہوئی ہے جو یہ کہتا تھا کہ "میں ہر آیت کو بتا سکتا ہوں کہ یہ کہاں اور کب اور کس موقع پر نازل ہوئی ہے"۔

اس میں تاریخ ہے، اس میں حکمت و اخلاق ہے، اس میں صنعتِ خداوندی میں حیرت و استعجاب سے پیدا شدہ مطالعہ و مشاہدۂ فطرت ہے، اس میں سیاسیات و معاشیات کے قرآنی اصول اور اس دور کے حالات پر ان کا اطلاق ہے، اس میں ہر صنف کا علم یعنی علمِ قرآن، علمِ فطرت، علمِ تاریخ اور علمِ النفس موجود ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ "کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو اس کتابِ مبین میں نہ ہو"۔ اور اس کا ہر انسان سے تفکر اور تدبر کا تقاضہ ہے، اسی تفکر اور تدبر کے نتیجہ میں نہج البلاغہ قرآنِ حکیم کے دعویٰ کی روشن ترین دلیل ہے۔

حضرت علیؑ کا فقہ اور اجتہاد میں جو مقام ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، مقدمات و خصومات کے فیصلہ اور قضا میں جو فہم و بصیرت آپ کو حاصل تھی وہ بے مثال ہے۔ علمِ صرف و نحو کی ابتداء بھی آپ سے منسوب ہے، آپ ہی نے ابوالاسود دیلمی کو کلام کی

تین قسموں اسم، فعل اور حرف کی طرف اشارہ کیا۔ تصوف کے اکثر سلسلے آپ ہی کے واسطہ سے شہرِ علم محمد مصطفےٰؐ تک پہنچتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ بغدادی فرماتے ہیں کہ "اصول اور آزمائش اور امتحان میں ہمارے شیخ الشیوخ علی مرتضیٰؓ ہیں"۔ لیکن اس استادِ عظیم کی سب سے عظیم تعلیم اس کی عظیم شخصیت ہے۔ اس نظامِ تعلیم کا جس سے یہ استاد تعلق رکھتا ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔ مقصد ہی انسان اور معاشرہ کی تعمیر ہے۔ جس طرح ایک درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک دین کی معرفت یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنی فتوحات کیں یا کتنی دولت حاصل کی بلکہ کیسی شخصیتیں اور کیسا معاشرہ پیدا کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنے آپ کو عامۃ الناس کا امام (یعنی استاد) بنانا چاہے، اسے چاہیئے کہ دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے خود کو تعلیم دے۔ زبان سے پہلے سیرت کی تربیت کرے۔ نفس کو مؤدب اور قابل بنانے والا دوسروں کو تعلیم دینے والے سے زیادہ قابلِ تعظیم و عزت ہے"۔ حضرت علیؓ کی سیرت کی ہمہ گیری اور گہرائی کے ساتھ ساتھ توازن ان کو انسانِ کامل کی ایک حیرت انگیز مثال بنا دیتے ہیں۔ علم و عمل، زہد اور جہاد، فرد کے حقوق اور ریاست کے تقاضوں، حرکت اور سکون، جلال اور جمال کا ایسا صحیح امتزاج اور اعتدال تصور میں آنا مشکل ہے۔ تاریخ کے پس منظر میں اس استاد کی سیرت اور شخصیت ایک تعلیمِ جاریہ ہے، کہنے والے نے آپ کو قرآنِ ناطق کہہ کر بہت صحیح بات کہی ہے۔ علامہ اقبال نے مومن کے ذکر میں تعلیم کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ع

قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

اس استاد اور اس مکتب کو عام استادوں اور مکتبوں پر قیاس مت کرو۔ اس استاد کا علم اس کی زندگی کا ایک حصّہ ہے اور اس کی ایک ذاتی صفت ہے جو ایک بوجھ کی طرح اس پر لدا ہوا نہیں ہے بلکہ نور کی طرح اس کے آگے چلتا ہے اور جوانب میں پھیلتا ہے۔ اللہ کی تمام زمین مسجد ہے تو تمام روئے زمین ہی اس استاد کا مدرسہ ہے، وہ مسجد کا منبر ہو یا دشمن کے خلاف میدانِ جنگ ہو یا دوستوں کی محفل ہو، آبادی ہو یا صحرا ہو، گھر ہو یا بازار، نفسِ انسانی تجربہ گاہ ہے اور مطالعہ کے موضوع آیاتِ الٰہی، وہ کلامِ الٰہی میں ہوں یا

صحیفۂ فطرت میں روز و شب کا اختلاف ہو اور قوموں کا عروج و زوال، انسان کی تقدیم و تقدیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کلامِ پاک میں علم کے ذرائع تین بتائے گئے ہیں۔ سمع، بصر اور افئدہ، عالمِ فطرت کا تعلق آنکھ سے اور عالمِ تاریخ کا تعلق کان سے ہے، اور قلب یا افئدہ تفکر و تعقل کا وہ محل ہے جو واقعات کو حقیقت میں اور موعظت و حکمت میں تبدیل کرتا ہے اور علم و حکمت کو انسانی شعور و اخلاق کی ایک صفت بنا کر آفاق و انفس کی وحدت کو قائم کرتا ہے۔ سمع اور بصر کا قلب سے رشتہ منقطع ہونے سے علم را بر تن زدن، اور علم کا بر دل زدن، کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

جناب علیؑ نے فرمایا :-

"علم دو طرح کا ہوتا ہے، ایک مسموع (سنا سنایا) اور ایک مطبوع (انسانی طبیعت کا حصہ) مسموع علم جب تک مطبوع نہ بن جائے اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہوتا۔"

سمع اور بصر کے قلب سے مغائرت کا نتیجہ یہ ہے کہ علم سے بجائے یقین پیدا ہونے کے تخمین و گمان، شک اور تردد پیدا ہو جاتے ہیں، اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم سے نور و حکمت حاصل کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے عقل کا غلام ہوتا جاتا ہے اور اسکے ذریعہ اپنی طاقت و دولت میں اضافہ کر کے سمجھتا ہے کہ علم کا فائدہ حاصل ہو گیا۔ جناب علیؑ نے فرمایا کہ :-

"بہت سے عالم ہیں جن کے جہل نے ان کو تباہ کر دیا حالانکہ علم ان کے پاس تھا مگر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔"

علم اور جہل کا اس سلسلہ میں ذکر کرنا بہت توجہ طلب ہے، گویا جہل علم کے موجود نہ ہونے کو نہیں کہتے، بلکہ علم کے صحیح آداب و مقام و استعمال سے ناواقفیت کو کہتے ہیں۔ جہل علم کی نہیں

بلکہ حکمت کی ضد ہے۔ ایک موقع پر آپ نے ایمان اور کفر و نفاق میں تمیز فرمائی ہے :۔

"علم بیکار کی چھان بین، اور فضول بحثوں سے اور تعصب اور جہالت سے اور حق سے روگردانی سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ یہ باتیں کفر اور نفاق کا راستہ ہیں، ایمان کے لئے یقین کی ضرورت ہے جو نکتہ رسی سے حقائق تک پہنچنے سے اور حکمت و عبرت سے حاصل ہوتا ہے۔"

آپ نے فرمایا کہ :۔

"تمھاری عقل کا یہی فائدہ کافی ہے کہ اُس نے تمھیں گمراہی کا راستہ راہِ ہدایت سے الگ کر کے واضح کر دیا۔"

پھر فرمایا کہ :۔

"دیکھنا آنکھوں ہی سے نہیں ہوتا کہ کبھی یہ آنکھیں دیکھنے والے کو غلط بھی دکھا دیتی ہیں، لیکن نصیحت طلب آدمی کا قلب دھوکہ نہیں دیتا۔"

گویا طلبِ ہدایت ہی راہِ ہدایت کی طرف رہبری کر دیتی ہے، پیاس ہی پانی کی طرف قدم اٹھا دیتی ہے۔

سمع اور بصر سے حاصل کئے ہوئے علم میں جمعیت اور وحدت اور یکسوئی قلب ہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اگر قلب سلیم ہے تو حکمتِ الٰہیہ بھی پیدا ہوتی ہے اور عمل کی تحریک بھی، ورنہ ذہن و عمل میں انتشار پیدا ہوتا ہے، نہ ایمان حاصل ہوتا ہے نہ عملِ صالح۔

آپ فرماتے ہیں :۔

"قلب بھی ایک حیرت انگیز چیز ہے، اس میں حکمت کی صلاحیت اور اس کے خلاف اور اضداد کی صفات بھی ہیں۔"

آپ نے فرمایا :۔

"حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، تو حکمت چاہے منافق ہی سے ملے لے لو، حکمت جہاں سے ملے لے لو۔ اس لئے کہ دانائی منافق کے دل میں بے چین رہتی ہے، یہاں تک کہ قلبِ مومن میں پہنچ کر اپنے مانند دوسروں

میں مل جاتی ہے۔"

صاحبِ علم کے بیان میں حقیقت کی گہرائی اور ہدایت کا زور ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"حکمت ایک درخت ہے جو دل میں اگتا ہے، دماغ میں پروان چڑھتا ہے اور زبان پر پھل دیتا ہے۔"

زبان سے آگے بڑھ کر وہ علم اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتا ہے، جیسا فرمایا:۔

"سب سے معمولی درجہ علم کا وہ ہے جو زبان پر ہو، اور بلند ترین وہ ہے جو اعضاء و جوارح سے ظاہر ہو۔"

اس علم کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے، اللہ کے رسولؐ کو بھی شہرِ علم ہونے کے باوجود ہدایت یہ تھی کہ علم میں ازدیاد کی دعائیں مانگیں، اسی سے دل کی زندگی قائم ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"یقیناً دل بھی اسی طرح تھک جاتے ہیں جیسے بدن، اس لئے ان کے لئے بہترین حکمتیں تلاش کرو۔" اور جو "لا ادری" (میں نہیں جانتا) چھوڑ دے اسی کی قتل گاہ اس تک پہنچ گئی۔"

علم کے تکبّر نے اس شخص کے علم میں ترقی ختم کر دی اور وہ دل کی موت مر گیا، علم حاصل کرنے کے منافی جناب علیؑ نے تین حالتیں بیان فرمائی ہیں۔

(۱) "ایک وہ جو دین کو دنیا کا آلہ بناتے ہیں، خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے بندوں پر برتری جتانے والے اور حجتوں سے اولیاء اللہ پر برتری چاہنے والے ہیں۔"

گویا علم انعامِ الٰہی ہے، اس کی شکر گذاری یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے عجز و انکسار اختیار کرے اور علم میں ترقی کی دعا کرے اور اپنے علم کے ذریعہ اللہ کے بندوں کی خدمت کرے، اولیاء اللہ علمِ الٰہی کے وارث ہیں، حسد کی پھونکوں سے ان چراغوں کو بجھانے کی کوشش کرنے کی بجائے ان چراغوں سے اپنا چراغ روشن کرے۔

(۲) "دوسرے وہ جو سچائی کے پرستار تو ہیں لیکن ان کے گوشہ ہائے قلب میں بصیرت نہیں۔ پہلا شبہ جو اُن کے دل میں پیدا ہوگا وہ شک کی چنگاریاں پیدا کر دے گا۔"

سچائی کی تلاش میں شبہات کا پیدا ہونا فطری بات ہے، اب اگر قلب میں بصیرت ہے تو اللہ تعالیٰ شبہات کو دُور کرے گا، اور یقین اخلاص کے مدارج میں ترقی کریگا۔ اگر قلب بصیرت سے عاری ہے تو شبہ شک بن کر کفر کی حد تک پہنچ سکتا ہے اور علم کے دروازے بند کر دے گا۔

(۳) تیسرے وہ لوگ جو لذّتوں کے از حد شوقین، خواہشات کے مطیع، اور جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی پر فریفتہ ہیں۔" یہ حرص وطمع ہے۔

گویا علم حاصل کرنے کے منافی حسد، تکبر، بے یقینی اور حرص وطمع کی مذموم صفات ہیں، علم حاصل کرنے کے لئے ایک خاص اخلاق کی ضرورت ہے۔

علم وحکمت کو خدا نے "خیرِ کثیر" فرمایا ہے۔ جناب علیؑ نے فرمایا:۔

"خیر کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی مال واولاد (دولت وقدرت) بڑھاؤ۔ خیر کا مطلب یہ ہے کہ اپنا علم بڑھاؤ اور اپنی بردباری میں عظمت پیدا کرو اور خدا کی عبادت کر کے لوگوں میں برتری حاصل کرو۔"

جب یہ علم انسان حاصل کرتا ہے تو وہ دنیا کے فریب میں نہیں آتا، نہ دنیا میں ملوّث ہوتا ہے نہ ترکِ دنیا کرتا ہے، بلکہ دنیا کی صحیح قدر پہچانتا ہے اور دنیا کے ذریعہ عقبیٰ کماتا ہے اور دنیا اور آخرت کی حسنات حاصل کرتا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا:۔

"دنیا اس کے لئے سچائی کا گھر ہے جو اس کے ساتھ سچا ہے۔ جو اسے سمجھ گیا اس کے لئے دارِ عافیت ہے۔ جو اس سے سامانِ سفر لے اسکے لئے دارِ غنا ہے۔ جو اس سے عبرت حاصل کرے اس کے لئے دارِ موعظت ہے۔

یہ دوستانِ خدا کی مسجد ہے، اس کے ملائکہ کا مُصلّےٰ ہے، وحی کی منزل ہے، اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔ جس میں وہ رحمت کماتے ہیں اور جنّت کا نفع اٹھاتے ہیں۔"

عقیدت

اسوۂ حسنہ

اسوہ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے۔ اسوہ اس نمونہ یا مثال کو کہتے ہیں جس کا اتباع یا تقلید کی جائے، سورۂ احزاب میں جہاں مسلمانوں کو سوائے اللہ کے ہر قسم کے خوف کو دل سے دُور کرنے اور اللہ کے راستے میں جہاد میں سرگرم ہونے کی ترغیب دی جارہی ہے وہیں کہا گیا ہے کہ تمھارے لیے اللہ کے رسولؐ میں اسوۂ حسنہ ہے، ان لوگوں کے لیے جن کی امیدیں اللہ اور یومِ آخرت سے وابستہ ہیں، اور جو کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں جہاں ایمان والوں کو بتایا جارہا ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے جو رشتہ ہے اس کے مقابلے میں تمام دنیوی رشتے ہیچ اور بے معنی ہیں اور ان کو اللہ اور اسلام کے دشمنوں سے مودت کے تعلق کو کسی درجہ میں بھی قائم رکھنے کے خلاف تہدید کی جارہی ہے، وہیں دو مقامات پر اللہ اور یومِ آخرت پر اپنی تمام امید رکھنے والوں کے سامنے سیرتِ ابراہیمی کو اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اور ان کے اس عمل کا ذکر کیا جارہا ہے کہ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اللہ کی خاطر اپنی قوم سے مکمل قطعِ تعلق کرلیا اور ان کی دشمنی اور مخالفت قبول کرلی۔ گویا اسوۂ حسنہ کی خصوصیت تمام دنیا سے کٹ کر خالصۃً اللہ تعالیٰ کا ہوجانا ہے، اپنے تمام خوف اور تمام امیدوں کو اسی سے وابستہ کرنا ہے۔ دنیا سے بے نیاز ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی نیاز مند ہونا ہے، اپنے تمام تعلقات، محبتوں اور رشتہ داریوں کو اللہ سے تعلق اور محبت اور رشتہ کے تابع اور اس پر قربان کرنا ہے، مختصراً اسوۂ حسنہ ذکرِ کثیر اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ذکرِ کثیر اور جہاد فی سبیل اللہ، ان دو اصطلاحوں میں انسانی زندگی کی مکمل تعبیر داخل ہے، ذکرِ کثیر انسان کے خدا سے تعلق کی طرف اشارہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ انسان کے دنیا سے تعلق کی طرف اشارہ ہے۔ ذکرِ کثیر کا مطلب یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کا، اس کے موجود و مقصود ہونے کا، اس کے سمیع و بصیر، ولی و مرجع و مالک ہونے کا، شعور ایک زندہ حقیقت کی طرح ہر وقت ہمارے قلوب میں روشن رہے اور جہاد کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہماری ہر کوشش انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل و احسان پر مبنی حیاتِ طیبہ کی تعمیر کے لیے وقف رہے، ذکرِ کثیر اور جہاد فی سبیل اللہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ذکرِ کثیر بغیر جہاد فی سبیل اللہ کے ایک روح ہے جسد سے عاری اور جہاد بغیر ذکرِ کثیر کے ایک جسد ہے روح سے محروم" شجرِ زندگی کی جڑ ذکرِ کثیر ہے۔ اس کا ثمر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

بیشک ہدایت کرنے والا اللہ ہی ہے، زندگی کی ہر سطح پر اور ہر منزل پر وہی اپنی مخلوق کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے سوائے ہدایت کرنے والا کوئی نہیں۔ ہدایت کی انتہا یہ ہے کہ اس نے ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے نبی بھیجے۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، تعینات و تشخصات میں اعتباری امتیاز و فضیلت ضرور ہے لیکن حقیقتِ واحدہ ایک ہی ہے، معرفت کی زبان میں اس کو حقیقتِ محمدیؐ کہتے ہیں۔ کمالِ رحمت یہ ہے کہ اس نے ذاتِ محمدیؐ کو جو تمام عالمین کے لیے رحمت ہے، جو زندگی کی پہنائیوں اور تاریکیوں میں سراجِ منیر ہے۔ بشر کی صورت میں ہماری طرف بھیجا۔ جس نے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی، ہمارا تصفیۂ قلب کیا، تزکیۂ نفس کیا، کتاب اور حکمت کا علم دیا، ہمیں وہ حقیقتیں دکھائیں جن کا ہم کو علم نہیں تھا۔ اس نے ہمیں ظلمت سے نور کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف نکالا، اسے اس لیے بھیجا کہ جب وہ ہمیں پکارے تاکہ ہمیں زندہ کرے تو ہم اس کی آواز پر لبیک کہیں، اس کا پکارنا اللہ کا پکارنا ہے، اسکا بلانا ایسا نہیں ہے جیسا ہم ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ اس لیے بھیجا کہ ہم اس کا اعزاز کریں، اس کی توقیر کریں، اس کی نصرت کریں، اپنے آپ سے اس کو اولیٰ جانیں، اس سے محبت کریں، اس کی اطاعت کریں، اس کا اتباع کریں۔

اطاعت بطیبِ خاطر کسی کا حکم ماننے کو کہتے ہیں، حکم تو بہر حال اللہ کا سب پر غالب ہے، مومن برضا و رغبت اس کا حکم مانتا ہے، کافر پر اس کی مرضی کے خلاف بجبر اہت

اس کا حکم چلتا ہے، اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی واجب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا رسولؐ جو حکم دیتا ہے وہ اپنی خواہش اور ہوا سے نہیں دیتا۔ بلکہ وہی کہتا ہے جو اس پر وحی کی گئی ہے، اور اللہ کا حکم ہمارے لیے وہ ہے جو اس کے رسولؐ کے ذریعہ ہم تک پہنچا، کیونکہ رسولؐ ہی احکامِ خداوندی کے معاملے میں ہمارے اور ہمارے خدا کے مابین واسطہ ہے۔ ہمارا خدا خدائے محمدؐ ہے۔ خدائے محمدؐ کے علاوہ ہر الٰہ باطل ہے۔ ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور اس سے تبرّا کرتے ہیں۔

اطاعت کے بعد درجہ اتباع کا ہے، اطاعت اور اتباع میں وہی نسبت ہے جو عدل اور احسان میں ہے۔ اطاعت حکم ماننا ہے اور اتباع کسی کے پیچھے اس کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم خالص اور مکمّل طور پر ملّتِ ابراہیمی کا اتباع کریں، اور سُنّتِ ابراہیمی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ انسان کا رُخ اللہ کی طرف ہو وہی اس کی سمت ہو، وہی اس کی منزل ہو، اس کے سامنے تسلیم و اطاعت کا سر خم رہے، وہی محبت، اور نفرت کا معیار ہو، اور اسی کے لیے جان اور مال اور وہ تمام چیزیں جو اُس نے دی ہیں وقف رہیں۔ ہمیں اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ ہم اپنی خواہشاتِ نفسانی کے غلام بنیں۔ یا اس آدمی کی اطاعت کریں جس کا قلب غافل ہو اور جو خود خواہشاتِ نفسانی کا پیرو ہو، گمراہ اور ارذل لوگوں کے اتباع سے اور محض اپنے ظن و گمان کی پیروی کرنے سے منع کیا گیا ہے، ہدایت اور حق اور ذکر و نصیحت اور اس نور کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس کو اللہ نے اپنے رسولؐ کے ساتھ نازل کیا۔

قرآنِ حکیم محض اوامر و نواہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ نور بھی ہے، اوامر و نواہی اطاعت کے لیے ہیں، نور اتباع کے لیے ہے، حضورؐ کا اسوہ آپؐ کی سیرت، آپ کا اخلاق خود قرآن حکیم ہے اگر ہم قرآن کے احکام کو مانتے ہیں تو یہ رسولؐ کی اطاعت ہے، اور رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اگر ہم ان احکام کو اپنے ارادے اور عمل کی ممکنہ صلاحیتوں کے ساتھ اور محمدؐ و آلِ محمدؐ سے مودّت و عقیدت کے ساتھ تسلیم و رضا، صبر و استقلال، اخلاص و ایثار کے جذبے سے مانتے ہیں جس کی آخری اور ناقابلِ رسائی حد خود حضورؐ کا اسوۂ مبارک

ہے تو یہ اتباعِ رسولؐ یا اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ہمیں اللہ سے محبت ہے تو ہمیں رسولؐ کا اتباع کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے رسولؐ کا اتباع کیا تو اللہ ہم سے محبت کرے گا۔ گویا ہمارے تمام عمل اوامر و نواھی کے دائرہ میں خالصتاً لوجہ اللہ ہوں، ذکرِ کثیر اور جہاد فی سبیل اللہ ہمارا شعارِ زندگی ہو۔ جس درجہ اخلاص اور خضوع و خشوع ہم اپنی عبادات، اپنے اخلاق اپنے معاملات میں پیدا کر سکیں۔ اس درجہ میں اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرے گا، اس درجہ کے انعامات کا کیا ذکر کیا جا سکتا ہے! ایک انعام تو یہی ہے کہ اس درجہ پر تمام برائیوں اور کثافتوں سے بچانے کی اور ہر آزمائش میں ہدایت اور نصرت کرنے کی ذمہ داری خود خدا پر ہے۔ یہی اتباعِ رسولؐ ہے، یہی اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے، اسی اطاعت اور اتباع سے انبیاءؑ اور صدیقین اور شہداء و صالحین کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اور وہ لاشریک اس کام میں ہمیں بھی اپنا شریک ہونے کا حکم دیتا ہے کہ ہم بھی نبیؐ پر درود و سلام بھیجیں، اس کی طرف سے درود رحمت ہے، ہماری طرف سے درود عبادت ہے۔ اور اس عبادت کا اجر یہ ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ مومنین پر بھی سلامتی اور رحمت بھیجتے ہیں تاکہ ان کو ظلمت سے نور کی طرف نکالیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۰ **

رہبرِ اعظم۔ سیاست میں

جب ہم حضورؐ کی سیرت کے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو ہم کو یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ مختلف پہلو ہم نے محض اپنی آسانی کے لیے مقرر کر لیے ہیں، اور حضورؐ کی سیرت کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے مربوط ، اور حضورؐ کی واحد اور ہمہ گیر شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ جس طرح انسانی جسم مختلف اعضاء کے مجموعہ سے زیادہ ہے، اس مجموعہ میں جان نہیں ہے اور جسم میں جان ہے جس طرح دائرہ کا علم بغیر مرکز کی معرفت کے ناممکن ہے اسی طرح حضورؐ کی شخصیت آپ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے مجموعہ سے زیادہ ہے اور آپ کی سیرت کا کوئی پہلو بغیر آپ کی شخصیت کی مرکزی حقیقت کو سامنے رکھے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ حضورؐ کی سیاست میں پیروی ناممکن ہے جب تک ان کے مقصد کو نہ اپنایا جائے اور قرآنی اخلاق نہ پیدا کیا جائے۔

حضورؐ کی سیاست کا مقصدِ وحید روئے زمین پر خدائے عادل کی حاکمیت کا قیام اور عالمگیر انسانی اخوت کی تشکیل تھا، ایک ایسا ماحول پیدا کرنا تھا جس میں انسان کی صلاحیتوں کی ترقی کے لیے، اس کے مادی اور روحانی ممکنات کو بروئے عمل لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع اور ترغیبات موجود ہوں۔ حضورؐ کی سیاست کا مقصد سیاسی طاقت کا حصول نہ تھا، تاریخ شاہد ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضورؐ کو سرداری کی پیشکش کی تھی، حضورؐ نے اس وقت یہ نہیں سوچا کہ میں عرب کا بادشاہ بن جاؤں تو پھر اسلامی "پروگرام" کو بآسانی رائج کیا جا سکتا ہے۔ اس پیش کش کو ٹھکرانا حضورؐ کی بڑی سیاست تھی۔ آپ نے کلمہ لاالٰہ کے ذریعہ ایک ہمہ گیر انقلاب شروع کیا، اس بیج کو لوگوں کے قلوب میں بویا، جب قلب بدلے تو نظر بدلی، قلب و نظر بدلے تو زمین و آسمان بدل گئے۔ ایک نئی دنیا پیدا ہو گئی۔ حضورؐ کی سیاست کا موضوع وہ غلبہ ہے، جو ایمان سے پیدا ہوتا ہے وہ طاقت ہے جو نیکی میں مضمر ہے۔

مرکزیت حضورؐ نے تحریکِ اسلام میں مرکزیت پر ابتدا ہی سے زور دیا۔ اپنے گھر سے اور اپنے ننھے والوں سے دعوتِ اسلام شروع کی، پھر اپنے قبیلہ کو دعوت دی۔ بلدِ امین مکّہ کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائی۔ کعبہ جو عرب جاہلیت کے زمانہ میں بھی ایک مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا، ہمیشہ حضورؐ کے پیشِ نظر رہا، جب کعبہ میں اصنام پرستی ہوتی تھی اس وقت بھی اپنے لیے کوئی علیحدہ عبادت گاہ نہیں قائم کی۔ مدینہ میں جا کر جب ملتِ اسلامیہ کی اساس مضبوط ہو گئی تو کعبہ اس نئی ملّت کا قبلہ بن گیا، گویا اس قیام مرکز سے ایک نئی ملّی زندگی کا افتتاح ہوا۔ جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کے اخراج کا حکم دینے میں بھی شاید یہی مصلحت تھی کہ دعوت عالمگیر سہی لیکن اس کا مرکز مضبوط ہونا بہت ضروری ہے۔

عالمگیر اشاعت لیکن جس طرح ایک تحریک کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مرکز مضبوط ہو اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔ مکہ میں ہی دعوتِ حق کو دور و نزدیک کے لوگوں تک پہنچانے کی آپ نے ہر ممکن کوشش فرمائی، کعبہ کے سالانہ اجتماع میں جو عرب دُور و نزدیک سے آتے تھے ان کو آپؐ حق کی دعوت دیتے تھے، طائف میں بنفسِ نفیس تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے۔ مکہ کے قیام کے دوران آپؐ نے اکثر اصحاب کو ہجرتِ حبشہ کا حکم دیا۔ انھیں کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِدھر مکّہ میں آپؐ کی مخالفت زور پکڑ گئی اُدھر مدینہ میں آپؐ کے حامی و ناصر بڑھ گئے۔ اگر حضور تبلیغِ حق کو مکّہ کے قیام کے دوران ہی میں مکّہ سے باہر پہنچانے کی کوشش نہ فرماتے تو گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ تحریک ایک ہی علاقہ میں ظاہر ہو کر محدود ہو جاتی یا اس میں بھی ایسی ہی تحریفیں ہو جاتیں جیسی عیسائیت میں ہوئیں، مدینہ سے روم اور ایران اور مصر اور حبشہ کے بادشاہوں کے نام خط لکھنا بھی اس دائرہ کو عالمگیر بنانے کی سعی تھی کیونکہ اسلام تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہدایت کا پیغام ہے۔

ہجرت حضورؐ کی سیاست کا ایک اہم جزو ہجرت ہے، ہجرت نہ خطرہ کے مقام سے فرار کو کہتے ہیں نہ مرکز سے دُور ہٹ جانے کو کہتے ہیں۔ مہاجر "پناہ گیر" کو

نہیں کہتے بلکہ اس مجاہد کو کہتے ہیں جو اپنے مقصد کو زیادہ مؤثر طریقے سے حاصل کرنے کی خاطر اپنی مقامی وابستگیوں کو قربان کر سکتا ہے اور مستقبل کی خاطر ماضی کو مٹا سکتا ہے۔ ہجرت سے کم از کم دو سال پہلے سے مدینہ میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی تھی اور یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اشاعتِ اسلام مکہ کے مقابلہ میں مدینہ منورہ میں زیادہ مؤثر اور آزادانہ طریقہ سے ہو سکتی ہے، ہجرت ایک طرف فتح مکہ کی طرف ایک قدم تھا تو دوسری طرف تمام عرب بلکہ تمام عالم میں اسلام کی اشاعت کی تمہید تھی۔

جہاد اب آپ دیکھئے کہ اسلامی انقلاب کے مخالفین کی کوششیں کس طرح اس الٰہی سیاست کے ذریعہ ناکام ہوتی جا رہی ہیں۔ پہلا حربہ کفر کا یہ تھا کہ اس زبردست انقلاب کو تضحیک کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔ جب یہ حربہ ناکام ہوا تو پھر سماجی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی، وقت ہوتا تو میں بتاتا کہ اس سماجی دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے کس طرح حضورؐ نے عرب کے قبائلی نظام سے فائدہ اٹھایا، پھر معاشی ناکہ بندی اور سماجی بائیکاٹ کے حربے استعمال کیے گئے۔ ہجرت کے ذریعہ اس حربہ کا بھی مقابلہ کیا گیا۔ اور مسلمان جوع اور خوف کی منزل سے نکل کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں قریشِ مکہ کو خود اپنی شام سے تجارت خطرہ میں نظر آنے لگی۔ اب آخری حربہ یہی رہ گیا کہ خود اپنے جانبازوں کو لے کر مخالفینِ اسلام یہود کو اپنے ساتھ ملا کر جو مدینہ میں ہی رہتے تھے، پھر عرب کے تمام مخالف قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر اُس ابھرتی ہوئی، پھیلتی ہوئی زندگی کو ختم کرنے کی آخری کوشش کی جائے۔ میرا اشارہ بدر، خندق اور احد کے غزوات سے ہے۔ جب اسلام اور کفر کا فیصلہ میدانِ جنگ میں مقدر ہو چکا تو مسلمانوں کو بھی جہاد کی اجازت ملتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تیرہ برس مدینہ میں جہادِ اکبر میں مصروف رہے ہیں، فنونِ حرب سے زیادہ اپنے نفس کی تربیت میں مشاق ہیں جنھوں نے صف بندی اور سمع اور طاعت کا ڈسپلن نماز میں حاصل کیا ہے جو اپنے مقصد کو جاہ سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں جو دن کے وقت میدانِ جنگ میں دشمنوں سے نڈر اس لیے ہیں کہ انھوں نے راتیں اپنے اللہ کے خوف سے روتے ہوئے گذاری ہیں، جن کے دل میں سوائے اسکے

کوئی آرزو نہیں ہے کہ اسلام کی تعمیر میں سنگِ بنیاد کی حیثیت سے کام آئیں۔ جہاد اسلامی سیاست کا مرکزی اصول ہے۔ یہ مسلمانوں کی رہبانیت ہے۔ یہ عدمِ تشدد اور امنسا کی نیم و ناقص حقیقتوں کا جواب ہے۔ یہ قوموں کی زندگی کا ضامن اور زوال کے رجحانات کے خلاف اس کا محافظ ہے۔

مدینہ کی ریاست مدینہ میں پہنچ کر اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی۔ وہاں سب سے اہم مسئلہ تو خارجی خطرہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ حضورؐ نے جہاد کے ذریعہ اس خطرہ کی مدافعت فرمائی، داخلی مسئلہ مہاجر اور انصار، اور مسلمانوں اور یہودیوں کا تھا، مہاجر اور انصار کا مسئلہ مواخات و اخوت کے ذریعہ حل کیا گیا، یہود کا مسئلہ ایک عہد نامہ کے ذریعہ طے کیا گیا۔ مدینہ کی ریاست کے شہری ہونے کی وجہ سے ان پر یہ فرض عائد کیا گیا کہ اس ریاست کی محافظت میں حصہ لیں اور ان کے دشمنوں سے ساز باز نہ رکھیں۔ اس فرض کی ادائیگی کے بعد ان کی پوری شہری آزادی کی ضمانت کی گئی، لیکن یہود کی بدبختی کہ وہ ہمیشہ اس ریاست کی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہے۔ اور اس عہد نامہ کی خلاف ورزی کرتے رہے اور اس کی پاداش کو پہنچے۔

صلحِ حدیبیہ قریش کی مخالفت جنگوں کی صورت میں بڑھتی رہی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہی۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ مکہ سے ہجرت کے بعد حضورؐ کا مکہ سے روحانی تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ مسلمان حج کے لیے مکہ کی طرف چلے۔ قریشِ مکہ نے مزاحمت کی اس وقت صلحِ حدیبیہ ہوئی جو حضورؐ کی سیاست کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ حضورؐ نے مان لیا کہ اس سال مسلمان بغیر حج کیے اس مقام پر قربانی کر کے واپس ہو جائیں۔ یہ بھی مان لیا کہ آئندہ سال تین دن کے لیے بغیر اسلحہ مسلمان حج کرنے کے لیے مکہ میں آئیں گے۔ یہ شرائط جو بظاہر بڑی کڑی معلوم ہوتی تھیں لیکن جن میں محض وقار کا سوال تھا، حضورؐ نے بڑی آسانی سے تسلیم کر لیں۔ لیکن ایک بڑی رکاوٹ جو تبلیغِ اسلام میں تھی یعنی مسلمانوں کے عرب قبائل تک پہونچنے میں قریشِ مکہ کی طرف سے مزاحمت۔ یہ رکاوٹ اس صلح نامہ کی رو سے دور ہو گئی۔ یہ صلح نامہ

جس میں بادی النظر میں مسلمانوں کی بات ہلکی ہوتی تھی حقیقت میں فتح مبین تھی۔ اب تمام عرب کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے دروازے کھل گئے اور جب تمام عرب قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو پھر فتح مکہ میں کیا رہ گیا۔ اس کا جواز تو خود کفار ہی صلحنامہ کی شرائط کی خلاف ورزی پر مجبور ہو کر پیش کر دیں گے۔

تربیتی پروگرام

قبائلِ عرب مسلمان تو ہو گئے تھے، لیکن اسلام میں ان کی تربیت ابھی ناقص تھی۔ حضورؐ نے اس کے لیے یہ تدبیر کی کہ ایک طرف مختلف قبیلوں کے کچھ لوگ مدینہ میں آکر رہیں اور واپس اپنے قبیلوں میں جا کر لوگوں کی تربیت کر سکیں۔ دوسری طرف، اپنے تربیت یافتہ اصحاب کو اطراف و جوانب میں بھیجا کہ مختلف قبیلوں میں رہ کر ان کی تربیت کریں۔ اس طرح مرکز سے دائرہ کا تعلق استوار رہے۔ اب دین مکمل ہو چکا تھا۔ یہ تربیتی پروگرام چل رہا تھا کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی۔

اصلاحات اور عرب کے مخصوص حالات

حضورؐ نے اپنی ہمہ گیر اصلاح میں عرب کے مخصوص حالات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ کوئی سیاسی اور سماجی اصلاح کا پروگرام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں معاشرے کے مخصوص حالات کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ عرب میں قبائلی نظام موجود تھا۔ حضورؐ نے اس کو ختم نہیں کیا، لیکن ایک مرکزی حکومت قائم کر دی، اور انسانی شرف کا معیار بجائے نسل کے تقویٰ قرار دیا۔ عرب میں کعبہ میں سالانہ اجتماع کی رسم موجود تھی۔ حضورؐ نے کعبہ کی مرکزیت کو زیادہ تقویت بخش دی اور اس سالانہ اجتماع کو حج کے فریضہ میں بدل دیا۔ عرب میں غلامی کا ادارہ تھا۔ اگر غلامی کے ادارے کو ختم کیا جاتا تو تمام اقتصادی نظام درہم برہم ہو جاتا۔ حضورؐ نے انسانیت کی روح پھونک کر اس ادارہ کی قلبِ ماہیت کر دی اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس انقلاب آفریں حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ ہر انسان خواہ آقا ہو یا غلام انسان ہے اور بہ حیثیت انسان اس کے کچھ حقوق ہیں جن کا احترام دوسروں پر واجب ہے۔ چھوٹے لوگ ظواہر پر توجہ دیتے ہیں اور رسوم کو بدلنے، اور اداروں کو توڑنے پھوڑنے میں لگے رہتے ہیں اور اسی کو اصلاح و انقلاب سمجھتے ہیں ——

رہبرِ اعظم کی سیاست یہ ہے کہ ان اداروں کی قلبِ ماہیت کر دیتا ہے۔ یہ اصلاح کی روح ان معاشروں میں بھی اجتہاد کے ذریعہ پھیلائی جا سکتی ہے، جو زمان و مکان کے لحاظ سے بہت مختلف ہوں۔ ایک عالمگیر اصول اس کو نہیں کہتے جس کے قیام و نفاذ میں کسی معاشرہ کے مخصوص حالات کا لحاظ نہ رکھا جائے بلکہ عالمگیر اصول وہ ہے جو مختلف انسانی معاشروں کے مخصوص حالات کے قلب میں ڈھالا جا سکے اور پھر اصلاحات کو بدل سکے۔ حضورؐ دنیا کے کامیاب ترین مصلح اور رہبر تھے۔ نیکی اور طاقت کا امتزاج جس کے لیے دنیا ترستی ہے۔ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا تھا نہ اس کے بعد کبھی ایسا ہوا۔ شاید حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے میں ایک یہ بھی رمز ہے کہ اس کے بعد کسی کو طاقت کا اندھا پرستار بننے کا یا نیکی سے مایوس ہونے کا کوئی عذر یا جواز باقی نہیں رہتا۔

**

صاحبِ خُلقِ عظیم

خَلق کسی چیز کو کرنے یا بنانے کے لیے پوری طرح اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔ خَلق اور خلق دونوں ایک ہی ہیں، خلق کا تعلق ظاہری چیزوں سے ہے مثلاً شکل و صورت جن کا حواس کے ذریعہ ادراک کیا جاسکتا ہے۔ اور خُلق کا تعلق باطنی قویٰ اور خصلت و عادت سے ہے جن کا ادراک بصیرت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہے۔ یعنی اس کی فطرت میں بہترین صلاحیتیں رکھی ہیں ایمان اور عملِ صالح کے ذریعہ وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ سکتا ہے جو فرشتوں کے درجہ سے بھی بلند ہے۔ حق کے انکار اور غفلت سے اس کا رجحان اور میلان پستی کی طرف ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ انسانیت کے پست ترین درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو جانوروں اور چوپایوں سے بھی پست تر ہے۔

اس طرح انسانیت کے مدارج و مراتب بے شمار ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی دو چیزیں اتنی مختلف نہیں ہوتیں جتنا ایک انسان اور دوسرا انسان، بشر تو سب ہوتے ہیں اس لیے کہ ظاہری شکل و صورت سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ دو عمل بظاہر ایک جیسے ہوں اس کے باوجود ان کی معنویت بہت مختلف ہو، انسانی تاریخ کا ایک حصّہ بلکہ شاید اس کی فطرت کا ایک خاصّہ جدال و قتال ہے لیکن ایک جنگ ظلم و فساد اور جوعُ الارض ہے۔ دوسری آدمی کی جنگ غیرتِ خداوندی کا مظہر اور اثباتِ حق کی دلیل ہوسکتی ہے۔ ایک شخص کے لیے شادی کا رشتہ قائم کرنا ایک فطری ضرورت کو پورا کرنا یا زیادہ سے زیادہ گھر کو آباد کرنا ہے، یہ ہوس رانی کی ایک جائز صورت بھی ہوسکتا ہے۔ دوسرے آدمی کا رشتۂ ازدواج کو قبول کرنا اس کی رحمت کی شان ہے کہ اس نے عالمِ ما و من سے یہ تعلق قائم کیا "تو بہارِ عالم دیگری ز کجا دریں چمن آمدی"۔

انسان کا مقام اس کا خُلق ہے، اس کی حیثیت ایک مرکز کی سی ہے۔ اس کا عمل اس مرکز کے چاروں طرف اور اس مرکز سے پیدا شدہ دائرہ ہے۔ دائرہ سے مرکز کی طرف رجوع کرنا اور مرکز سے دائرہ کی طرف بازگشت، ایک انسان کی زندگی سے اس کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اور اس کی ذات کی بصیرت کی روشنی میں اس کے ایک ایک عمل کو سمجھنے کی کوشش کرنا بھی اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور ایک انسان کے مقام اور دوسرے انسان کے فرق کو سمجھنا، ادب کی زبان میں حفظِ مراتب کہلاتا ہے۔ اسی طرف رومیؒ نے اشارہ کیا ہے۔ ع

"کارِ پاکاں را قیاس خود مگیر"

حضورؐ کے خُلق کا روشن نقطہ جیسا کہ بی بی عائشہ نے بہت بلیغ انداز میں بتایا ہے خود قرآن شریف ہے۔ گویا قرآنِ حکیم اور حضورؐ کی حیاتِ مبارک میں یہ تعلق ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ مبارک قرآن کی تفسیر ہے اور قرآن حضورؐ کی حیاتِ مبارک پر معنوی تبصرہ ہے۔

تمام انبیاء انسانی نقطۂ شرف پر فائز تھے۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔ لیکن ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حقیقت ایک ہی ہے، لیکن ہر عہد و عصر کے لحاظ سے اور مشیتِ ایزدی کے مطابق اس حقیقتِ بسیط کے شیئون مختلف ہیں۔ کہیں یہ حقیقت حضرت موسیٰؑ کی صورت میں عدل و انتقام، قانون و شریعت کی جلالی شان سے ظاہر ہوئی، کہیں یہ حقیقت حضرتِ عیسیٰؑ کی صورت میں رحم و رأفت، عفو و درگذر، عجز و انکسار کی جمالی کیفیت میں ظاہر ہوئی۔ کہیں یہ حقیقت حضرتِ داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی صورت میں ان شعبوں میں ظاہر ہوئی۔ جن کو عرفِ عام میں کارِ دنیا کہا جاتا ہے۔ مثلاً حکومت کا نظم و نسق، سلطنت کا جنگ و شکوہ، رشتۂ ازدواج و مناکحت۔ اور کہیں یہ حقیقت حضرتِ یحییٰؑ کی صورت میں مطلق ترکِ دنیا، زہد اور فقر میں ظاہر ہوئی۔ غرض حقیقت واحد و متحد ہے جس کو معرفت کے محاورہ میں حقیقتِ محمدیؐ کہتے ہیں۔ تعینات و تشخصات میں اعتباری فرق و فضیلت ہے۔

تاریخی طور پر حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جتنے گوناگوں تعلقات اور کیفیات و حالات پائے جاتے ہیں اتنے کسی انسان کی زندگی میں مشکل ہی سے تصور کیے جا سکتے ہیں۔ تمام چھوٹے بڑے رشتے، خانہ داری اور ان کی ذمہ داریاں ایک خاندان میں یتیم اور سرپرست اور باپ، بھائی، شوہر کی حیثیت میں آپ کی زندگی میں موجود ہیں۔ آپ کے نہ صرف وہ دوست ہیں جو اپنی جان نثار کرنے کی تمنا دل میں لیے ہیں، نہ صرف وہ دشمن ہیں جو تمسخر اور استہزا سے لگا کر خون بہانے تک سب کچھ کر گذرنے کی فکر میں ہیں۔ بلکہ ان حاسدوں اور متکبر لوگوں سے بھی سابقہ ہے جو عہد کرنے کے بعد غداری کرتے ہیں اور ان منافقین سے بھی واسطہ ہے جو دوستی کے روپ میں جڑیں کاٹنے کی فکر میں ہیں۔ شعبِ ابوطالب میں قید و ظلم کی کیفیت، ترکِ وطن اور ہجرت کی کیفیت، شارع اور ہادی کی حیثیت، جنگ اور صلح کے حالات، تمکن اور فتح کی کیفیت، سیاستِ مدن، تدبیرِ منزل، غرض زندگی کا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جو آپ کی حیاتِ مبارکہ میں نہ پایا جاتا ہو۔ تو وہ حقیقتِ زندگی کے جتنے مختلف گوشوں میں پھیلے گی۔ اتنا ہی اس کا ظہور مکمل ہوتا ہے اور خُلقِ عظیم کی تفسیر ہوگی۔ اکملت لکم دینکم کا پس منظر حضورؐ کی زندگی کے ۲۳ سال نہیں تھے بلکہ دین کی پوری تاریخ تھی۔

اور ان گوناگوں تعلقات میں ایسے شئون و مظاہر ہیں جو بظاہر متضاد کیفیات کے حامل نظر آتے ہیں۔ ابتدائی حیات میں ہی اعتکاف بھی ہے۔ تجارت کا لین دین بھی ہے۔ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی ہے۔ فوج کی سپہ سالاری بھی ہے۔ راتوں کی عبادتیں بھی ہیں، دن میں زندگی کے جھگڑے اور بکھیڑے بھی طے کرنے ہیں۔ کفر اور باطل کے خلاف شدت بھی ہے۔ معاہدہ توڑنے والوں کے خلاف، خدائی عدل و انتقام کے مظہر بھی ہیں، اور جہاں اپنا ذاتی معاملہ ہو وہاں انتہائی عفو و کرم بھی ہے۔ فقر و زہد بھی انتہا درجہ کا ہے۔ لی مع اللہ کی وہ شان بھی ہے جس میں اپنی بیوی تک کو نہ پہچانیں۔ دنیا کے کاموں میں اتنی ذمہ دارانہ مصروفیت اور دنیا سے اس درجہ لاتعلقی

اور بے نیازی انسانی تصور میں نہیں آسکتی۔

جو کچھ لوگ یہ کہہ کر کہ اسلام میں دین بھی ہے اور دنیا بھی ہے، چند مذہبی رسوم ادا کرنے کے ساتھ دنیا داری میں ملوث ہونے کا جواز پیدا کرتے ہیں ان کے متعلق مولانا رومؒ نے بہت صحیح فرمایا ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دون　　این خیال است و محال است و جنون

اس کا مطلب اگر کچھ ہے تو یہی ہے کہ دنیا کے چھوٹے بڑے کاموں میں بھی دین کی روح کو جاری و ساری کیا جائے۔ زندگی کے سلسلے کی پہلی کڑی عبادات کی، آخری کڑی معاملات کی اور اُن کے بیچ کی کڑی اخلاق کی ہے، لیکن یہ ہیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں۔

حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کے عمودی محور کی ایک جہت بشریت ہے، اور دوسری جہت نور اور حقیقت سے متعلق ہے۔ اسی طرح افقی محور کی ایک جہت جمال ہے اور ایک جہت جلال ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میں جہاد کا نبیؐ ہوں اور رحمت کا نبیؐ ہوں۔

جمال کی جہت میں کرم اور عفو، ایثار و شفقت، قناعت و سخاوت کی صفات ہیں، کہ بغیر کرم کے عفو اپنی برتری جتانا اور دوسرے کو ذلیل کرنا ہے۔ بغیر ایثار کے شفقت تصنع اور دنیا داری ہے۔ بغیر قناعت کے سخاوت تبذیر ہی کی ایک صورت ہے۔ حضورؐ کے خلقِ عظیم کی یہ شان بشیری کی شان ہے۔ دوسری جہت جلال ہے، جس میں اعلائے حق اور اثباتِ حق میں شدت کی صفت ہے۔ یہ جہاد ہے اپنے نفس کے خلاف جہاد جسے جہادِ اکبر کہتے ہیں، یہ عصمت کی دلیل ہے، باطل کے خلاف جہاد، جسے جہادِ اصغر کہتے ہیں۔ یہ دونوں فی سبیل اللہ جہاد ہیں۔ جہاد ہمیشہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔ عصمت کے بغیر جہاد نہیں ہوتا ہے، فساد ہوتا ہے۔ یہ حضورؐ کی نذیری شان ہے۔ اور یہ دونوں بشیری اور نذیری شانیں رحمۃ للعالمینی ہیں۔ اس افقی محور اور عمودی محور کے دونوں جہات کا نقطۂ اتصال، ان کا توازن اور امتزاج، اخلاص کی منزل ہے۔ سادگی اور بیرنگی کی منزل ہے۔ صدق اور عدل اور حق کی منزل ہے۔ عبدیت و تسلیم و رضا کی منزل ہے۔ یہ برزخِ کبریٰ کا مقام ہے، مجمع البحرین کا مقام ہے، قاب قوسین کا مقام ہے، یہ احمد و حامد و محمود و محمدؐ کا مقام ہے۔ ع "کارِ پاکاں را قیاس خود مگیر"

اقبال اور عشقِ رسولؐ

ملّتِ اسلامیہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک طرف اکثر اقوام و ملل کے طریقے کے برخلاف اس نے اپنے مؤسس اور بانی محمد مصطفےٰؐ کو الوہیت کے درجہ پر فائز نہیں کیا اور دوسری طرف جس نوعیت اور شدّت، جس کیفیت اور کمیت کی عقیدت اور محبت اور وابستگی اس ملّت کے ہر فرد کو حضورؐ کی ذات سے ہے وہ بھی اجتماعی نفسیات کی ایک منفرد حقیقت ہے۔ اس خصوصیت میں ہمارے عارف و عامی، عالم و جاہل، نیک و بد سب برابر کے شریک ہیں کیونکہ اس کا مقام اخلاقی یا ذہنی، یا جذباتی سطح سے بہت گہرا ہے۔ یہ محبّت نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خون کے ساتھ گردش کرتی ہے، گویا اس سے ہٹ کر ہم اپنا بہ حیثیت انسان یا بہ حیثیت مسلمان تصوّر ہی نہیں کر سکتے، ہاں اس کا مظاہرہ ہر فرد کی مختلف ذہنی اور جذباتی افتاد کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ عشقِ رسولؐ ہی اقبالؔ کے مختلف بلکہ کبھی کبھی متضاد اور متنوع خیالات و جذبات کا شیرازہ بند ہے، اس کی فکری زندگی کے تجربات کا سب سے طاقتور محرک اور سب سے سچا حاصل عشقِ رسولؐ ہے۔ یہی روشنی کی پہلی کرن ہے، یہی امید کا آخری ستارہ ہے، یہی اس کا سب سے گہرا تجربہ اور صادق ترین جذبہ ہے، یہ رشتہ اس وقت سے شروع ہوا جب اس نے اپنے باپ کی زبان سے اس نام کو سنا اور اسی عشق کے ذریعہ اس نے شعوری طور پر اپنے آپ کو پہچانا۔

اقبالؔ کے فن و فکر کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ایک ہجرت ہے۔ اقبالؔ نے اس وطن سے ہجرت کی جو زمین و مکان کے ایک خاص خطّہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں وہ تاریخی وقت کے ایک خاص مرحلے پر پیدا ہوا۔ اس نے اس دیس میں ہجرت کی جو مکان و زمان میں ہوتے ہوئے اس کی بندشوں سے آزاد اور بلند ہے، جو ہر جگہ ہے اور کسی جگہ سے پابند نہیں ہے، جہاں نو بنو تاریخی انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں اور جو خود ان تاریخی

انقلابات سے ماورا ہے، اس دیس کا نام اسلام ہے، دلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ، دجلہ، گنگا، نیل، راوی، یہ سب اس دیس کے تاریخی جغرافیہ میں آنے والے نام ہیں۔ یہ دیس ان دیسوں سے مختلف ہے جو وطنیت کے نام پر قائم کئے جاتے ہیں اور جو مخلوقِ خدا کو اقوام میں بانٹ دیتے ہیں، اور تعصب و تنگ نظری اور غیروں سے نفرت اور اپنی برتری کی جنگوں کی فضا سے عالمِ انسانیت کو مسموم کرتے رہتے ہیں۔ اس دیس کا وجود تمام عالمِ انسانیت کے لیے وحدت، حریت، مساوات، اخوّت کا پیغام اور پیغام کی ضمانت ہے۔ اس دیس کی تاسیس سے عالمِ آب و گل میں فروغ ہوا، زندگی اپنے شباب تک پہنچی اور ایک نئی دنیا پیدا ہوئی۔

اس دیس کا مرکز اور محیط، اس کا مؤسس اور اس کی اساس، اس کی زندگی اور اس کا نور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس نے غار کی خلوتوں میں دنیا کو ایک نیا آئین و تمدن دیا اور ایک جہانگیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا ملت کی تخلیق کی۔ اس کی آنکھیں نماز میں اشکبار ہیں اور اس کی تیغِ آہن گداز نے سلاطین کی نسل قطع کر دی، وہ خود بوریہ نشین رہا اور قیصر و کسریٰ کے تاج اس کے قدموں تلے روندے گئے۔ بالا و پست اس کی نظر میں ایک تھے، وہ دین کی کلید سے دنیا کو کھولنے والا تھا، اور اس دیس کی تمام جلالی و جمالی شان وہ سنجر و سلیم کی شوکت ہو یا جنیدؒ یا بایزیدؒ کا فقر ہو اسی کی ذاتِ گرامی کا جلوہ ہے۔

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد مسلمانوں کی ہزیمت و حرماں، شکست و ریخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ آج اس ملت کے پاس نہ دین ہے دنیا ہے، غیروں کے پاس شان و شوکت ہے، دولت و عزت بھی ہے، حور و قصور بھی ہیں مسلمانوں کے لئے ایک خیالی دنیا رہ گئی ہے جہاں کچھ وعدوں کے سہارے وہ دنیا کی تلخیاں اور ذلتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اقبالؔ نے شاعری کو ایک نیا مقام دیا، وہ اپنا منصب یہ سمجھتے ہیں کہ بھٹکے ہوئے قافلے کو منزل کی راہ پر لگایا جائے، وہ دیدۂ بینائے قوم ہیں، عندلیبِ باغِ حجاز ہیں، وہ مریض و نیم مردہ قوم کو تمام چارہ گروں سے چھڑا کر اس رشکِ مسیحا کے پاس

لاتے ہیں جس کے نام سے دنیا میں اجالا ہے اور جس کی وجہ سے نبضِ ہستی تپش آمادہ ہے۔ خمستانِ حجاز کے رندوں کو مدت کے بعد پھر ہوش آتا ہے، ملت میں نئی زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں، اقبال قوم کو امید کا پیغام دیتے ہیں، سورج کا ایک افق پر غروب ہونا دوسرے افق پر طلوع ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ اور وعدہ سناتے ہیں۔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ رشتۂ عشق ملت کی نسبت سے قائم و دائم ہے، اقبال کی ذاتی زندگی میں عشق رسولؐ کا کیا مقام ہے؟ اقبال کے عقیدہ کے مطابق محمد مصطفےٰؐ کی ذات انسانی ارتقا اور معراج کی آخری منزل ہے، عبدہٗ کی منزل پر فائز ہو کر اور ذاتِ احد سے روبرو ہو کر اس ذات کے قلب و نظر اس کے ظرف و جوہر کا امتحان ہو چکا ہے، آپ کے آخری نبی ہونے کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کے شعلوں نے سو ابراہیمؑ کو جلا کر ایک محمدؐ کا چراغ روشن کیا ہے۔ عالم کے خلق اور تقدیر اور ہدایت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس ابتدا کی انتہا رحمۃ للعالمین کے ظہور پر ہو۔ وہی باعثِ کائنات ہے، وہی لوح ہے، وہی قلم ہے، وہی الکتاب ہے، وہی آدم ہے، وہی جوہر ہے، ایک فرد کی خودی عشق ہی سے استحکام پاتی ہے۔ محبوب کی آواز ہی سے دل کی زندگی ہے، اور دل مسلم تو ہے ہی مقامِ مصطفےٰؐ۔ اسی نام سے ہماری آبرو ہے، اور وہ محبوب بھی ایسا ہے جو مٹی کے تودوں کو انسان بنانے والا اور غبارِ راہ کو وادیِ سینا کا فروغ بخشنے والا ہے۔ اقبال کو جب سے اس سے معرفت حاصل ہوئی ہے وہ ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے، اسی کے عشق نے اقبال کے دل میں آگ لگائی ہے۔ اسی عشق کا شور اقبال کی بانسری میں ہے، محمد مصطفےٰؐ رحمت کا بادل ہے، اقبال اس سے سیراب ہونے والا بستان، یہی عشق اس کی جملہ علتوں کا علاج ہے، افرنگی دانش اور زناریِ ایمان کی چارہ سازی مولائے یثرب ہی کر سکتا ہے، اقبال کا ذکر و فکر، علم و عرفان، خشکی اور دریا اور طوفان سب اسی کی ذات ہے۔ اس کی آئین کی پابندی سے خودی کی تعمیر و تربیت ممکن ہے۔ اس شہسوار کے نخچیر ہونے سے اور اس صاحبِ دولت کے فقر اک سے

وابستہ ہونے سے خود مہ و پروین نخچیر ہو جاتے ہیں اور جبرئیلؑ سے بڑھ کر خود یزداں کمند میں آجاتا ہے، گویا عشقِ رسولؐ نور بھی ہے حرارت بھی، طاقت بھی ہے اور حرکت بھی، ابھارنے والا جذبہ بھی ہے اور روکنے والا قانون بھی۔

دربارِ محمدیؐ میں اقبالؔ کچھ آرزوئیں لے کر حاضر ہوتے ہیں، ایک دعا تو یہ ہے کہ عمل کی توفیق نصیب ہو جائے، ایک آرزو مدینہ میں دفن ہونے کی ہے، تاکہ فلک کے سامنے اپنے انجام پر فخر کر سکیں، ایک پیہم دعا اپنی قوم کے لیے ہے کہ اس کے جوان ان کے نالۂ شب اور آہِ سحر کے ورثہ دار بن جائیں اور ملّت کی زمین کو ابرِ بہاری نم کر دے تاکہ وہ ان کے بوئے ہوئے دانے کو قبول کر لے، ایک دعا یہ ہے کہ اقبالؔ تو ہوا میں اُڑتی ہوئی گردِ راہ کی طرح پریشان ہیں تو اس گرد میں سے وہ شہسوار نمودار ہو جو زندگی کے تمام پنہاں ممکنات کو ذوقِ تجلّی دے دے۔ اقبالؔ کے لئے کچھ معنی میں محمد مصطفےٰؐ، اللہ سے محبوب تر ہیں۔ اقبالؔ غلام ہونے کی وجہ سے دُرود پڑھتے ہوئے خجالت سے آب آب ہو جاتے ہیں۔ غیر کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے بعد محمد مصطفےٰؐ کے حضور کیسے آنکھ اٹھ سکتی ہے۔ اور یومِ حساب اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اقبالؔ کے اعمال کا حساب لینا ناگزیر ہو تو اقبالؔ کی التجا یہ ہے کہ یہ حساب نگاہِ مصطفےٰؐ سے پنہاں کیا جائے۔ ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　بادشاہا! عذرہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر　　از نگاہ مصطفےٰؐ پنہاں بگیر

یومِ وفاتِ علیؑ

فاتحِ خیبر

محمدؐ رسول اللہ کا ہر قدم اسلامی تاریخ کا ایک نیا موڑ تھا۔ حضورؐ نے جب مکّہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو اسلام کی تاریخ ایک نئے دَور میں داخل ہوگئی، اب ایک ایسے معاشرہ کی تخلیق مدِ نظر تھی جس کا مقصد زمین پر عدل اور اللہ کی عبادت کو قائم کرنا ہو۔ اِس ابھرتی ہوئی نئی دنیا کو طاقت پکڑتے ہوئے دیکھ کر سب اہلِ غرض طبقے اور گروہ مخالف ہوگئے۔ قریش کی مخالفت تو روزِ اوّل سے چلی آرہی تھی، وہ ناراض تھے کہ انھیں میں کا ایک آدمی قریش کی سرداری ختم کرنے کے دَر پے ہے۔ انھیں یہ بصیرت کہاں کہ وہ یہ دیکھتے کہ وہ قبائلی سرداری کو ختم کر کے انسانی سرداری کا راز بتا رہا ہے۔ مدینہ میں آکر یہود سے واسطہ پڑا۔ حضورؐ کو خیال تھا کہ یہ لوگ اہلِ کتاب ہیں۔ شاید سچائی کو پھیلانے میں ساتھ دیں۔ یہ لوگ جو عالمگیر سچائی کو اپنی جاگیر سمجھے ہوئے تھے کس طرح سمجھ سکتے تھے کہ محمدؐ کے ذریعہ دینِ موسوی کی تکمیل ہو رہی ہے۔ ادھر محمدؐ کے مدینہ میں قیام سے ان کا مدنیہ کی سرداری کا خواب پریشان ہو رہا تھا۔ نہ بدوی قبیلے جو اپنے رسم و رواج غلامی کو آزادی سمجھتے تھے۔ یہ بات سمجھ سکتے تھے کہ صحیح آزادی اس تنظیم اور مرکزیت میں مضمر ہے جو اسلام پیدا کر رہا تھا۔ غرض قریش اور یہود اور بدوی قبائل سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ اس پھیلتی ہوئی روشنی کو گل کر دیا جائے۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ، حضورؐ نے تو یہودیوں سے دوستانہ معاہدے کئے اور ان کو اپنا حلیف بنایا۔ لیکن مشرکینِ مکّہ تو کھلم کھلا ہی حضورؐ کی مخالفت کرتے تھے۔ یہود مخالفت میں زیادہ تر مکر و فریب سے کام لیتے تھے۔ معاہدہ کر کے توڑنا پھر معاہدہ شکنی کے جواز میں معذرتیں پیش کرنا۔ در پردہ مشرکین سے ساز باز کرنا اور ان کو اکسانا کہ وہ مدینہ پر باہر سے حملہ کریں اور یہود داخلی طور پر انتشار

پھیلائیں۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کی اہانت کرنا۔ خود حضورؐ کے قتل کی سازشیں کرنا۔ یہ ان کا وطیرہ تھا، جب یہ تمام تدبیریں کارگر نہ ہوئیں اور ان کو اپنے کئے کی ہر وقت سزا ملتی رہی تو انھوں نے خیبر کو اپنی تمام تخریبی اور معاندانہ کارروائیوں کا مرکز بنایا۔

خیبر مدینہ سے تین روز کی مسافت پر یہود کی بستی تھی جہاں ان کے چھ مضبوط قلعے تھے۔ قلعہ بند ہو کر وہ اس کوشش میں مصروف تھے کہ تمام عرب کے بدوی قبیلوں بنی اسد، بنی کنان، بنی قحطان کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے مشتعل کیا جائے اور خود خیبر کے مضبوط قلعوں سے اس شورش کی پشت پناہی کی جائے۔ یہ گویا یہودیوں کی آخری کوشش تھی کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور اسی وجہ سے اس کوشش پر وہ اپنی طاقت اور تدبیروں کو صرف کرنے کے درپے تھے، انھوں نے دس بارہ ہزار کی جمعیت اکٹھی کر لی اور مدینہ پر حملہ کرنے والے ہی تھے لیکن حضورؐ ان کو اس بات کا موقع کیسے دے سکتے تھے۔ حدیبیہ کے مقام پر قریشِ مکہ سے ۶ھ ہجری میں صلح کرنے کے بعد جب وہ مدینہ واپس لوٹے تو بلا توقف اپنے ساتھیوں کو خیبر کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیدیا۔ یہود نے اپنے خزانہ کو ایک قلعہ میں جمع کیا۔ اپنی رسد اور اہل وعیال کو دوسرے قلعہ میں محفوظ کیا، اپنی فوج کو ایک تیسرے قلعہ میں رکھا، مسلمان تعداد میں ڈیڑھ ہزار کے قریب تھے۔ یہود کا اندازہ تھا کہ مسلمان بیک وقت تمام قلعوں کا محاصرہ نہیں کر سکیں گے۔ جنگ طول پکڑے گی اور جب جنگِ احزاب میں مشرکین اور قبائلِ عرب کی پشت پناہی کے باوجود مدینے کے محصور مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے تو مسلمان بھی خیبر میں یہود کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے اور بالآخر پسپا ہوں گے۔ مسلمانوں اور یہود کے اس فیصلہ کن معرکہ کے ہیرو حضرت علی ابن ابیطالب ہیں، جن کو عام طور سے فاتحِ خیبر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ابتدائی جھڑپوں میں مسلمان کامیاب ہوتے رہے لیکن جب وہ یہود کے خاص قلعہ قموص کے سامنے پہنچے تو مسلمانوں کے قدم رک گئے، یہ سب سے مضبوط قلعہ تھا حضور روزانہ مسلمانوں کے لشکر کو مختلف لوگوں کی سرکردگی میں روانہ کرتے تھے لیکن لشکرِ اسلام روزانہ محاصرہ سے ناکام واپس ہوتا تھا۔ محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور یہود یہی بات چاہتے تھے۔

مشرکین و منافقین میں بہت لوگ ایسے تھے جو بدر، احد اور خندق میں مسلمانوں کی کامیابی سے خاموش ہو گئے تھے، لیکن ان کے دلوں میں مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں کی ناکامی اور پسپائی کی خبریں عام ہوئیں تو وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر حملہ آور ہوں گے، مدینہ خود منافقوں سے خالی نہیں تھا۔ مدینہ کے اندر شورش پیدا ہونے کا خطرہ بھی مدِّ نظر تھا، یہ حالات پریشان کن تھے اور ایک ایک دن جو گذر رہا تھا اِس پریشانی میں اضافہ کرنے والا تھا اور یہ پریشانی محض اس صورت میں دور ہو سکتی تھی کہ یہود پر فوری طور سے ایک فیصلہ کن فتح حاصل کی جائے۔

حضرت علیؑ کو ان دنوں آشوبِ چشم کا عارضہ لاحق تھا اور حضورؐ کے مدینہ سے روانگی کے وقت حضرت علیؑ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے، لیکن شوقِ جہاد نے مدینہ میں بیٹھنے نہ دیا اور اسی حالت میں خیبر پہنچ چکے تھے۔ حضورؐ نے جب لشکرِ اسلام کی روزانہ پسپائی دیکھی تو آپ نے فرمایا کہ "کل میں علم ایسے شخص کو دوں گا جو کرّار بار بار حملہ کرنے والا ہوگا، بغیر فتح حاصل کئے واپس آنے والا نہ ہوگا، خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں اور وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔" لوگ منتظر تھے کہ یہ سعادت کس کو نصیب ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ کی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا کیونکہ وہ مریض تھے۔ دوسرے دن حضورؐ نے علی الصباح حضرت علیؑ کو طلب فرمایا، اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں پر لگایا اور لشکرِ اسلام کا علم ان کے سپرد کیا۔ حضرت علیؑ نے اس دن یہودیوں کے آٹھ نامی پہلوانوں کو تہ تیغ کیا جن میں مرحب، عنتر اور حارث بھی شامل تھے، قلعہ کا دروازہ اکھاڑ دیا، لشکرِ اسلام کو خندق پار کروا کے قلعہ میں داخل کیا اور چار گھنٹے میں قلعۂ خیبر پر اسلامی علم لہرانے لگا۔

فتحِ خیبر کے بہت دن بعد کسی شخص نے حضرت علیؑ سے کہا: "یا علیؑ! خیبر میں تو آپ نے حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کیا۔" حضرت علیؑ متبسّم ہوئے اور فرمایا: "وہ قوتِ جسمانی نہیں تھی قوتِ ایمانی تھی۔" بے شک جسمانی قوت کی ایک حد ہوتی ہے، لیکن ایمانی قوت کی کوئی حد نہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں جتنے غزوات ہوئے حضرت علیؑ نے ان میں وہ مثالی کردار ادا کیا کہ مسلمان مجاہد کے لئے ایک نمونہ بن گئے اور آپ کا نام جہاد کا نعرہ بن گیا۔

ہمارے ملک پاکستان میں سب سے عظیم فوجی امتیاز "نشانِ حیدرؓ" کہلاتا ہے۔ سب سے پہلے مشرکین کے مقابلہ میں اور اسلام کی حمایت میں جو تلوار اٹھی وہ یا حضرتِ حمزہؓ کی تھی یا حضرت علیؑ کی تھی۔ حضرت علیؑ کی ذوالفقار کے ساتھ بہت سی روایتیں وابستہ ہیں۔ حضرت علیؑ کے ساتھ ذوالفقار کا بھی ذکر کیا جاتا ہے "لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیفَ اِلَّا ذوالفقار" مجھے ذوالفقار کی تاریخ معلوم نہیں لیکن حقیقت معلوم ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ حضرتِ علیؑ کی تلوار تھی اور حضرت علیؑ کی تلوار حق و باطل کی فارق تھی۔ جو چیز جہاد کو عبادت کا درجہ دیتی ہے وہ محض بہادری نہیں ہے بلکہ وہ نیت کا خلوص ہے جس سے جہاد کیا جاتا ہے۔ فاتحِ خیبرؓ کو مثالی مجاہد بنانے والی صفت محض آپ کی شجاعت نہیں ہے بلکہ اخلاصِ عمل ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی مثنوی کے پہلے دفتر میں ایک حکایت نظم کی ہے ؎

از علیؑ آموز اخلاصِ عمل — شیرِ حق را دان منزّہ از دغل
در غزا بر پہلوانی دست یافت — زود شمشیری بر آورد و شتافت
او خدو انداخت بر روئے علیؑ — افتخارِ ہر نبیؐ و ہر ولی
او خدو انداخت بر روئے کہ ماہ — سجدہ آرد پیشِ او در سجدہ گاہ
افتخارِ ہر ولی و ہر وصی — کرد نارِ غیظ بر خود منطفی
در زماں انداخت شمشیر آن علیؑ — کرد او اندر غذایش کاہلی

حضرت علیؑ نے ایک پہلوان کو زیر کیا، اس پہلوان نے جناب علیؑ کے منہ پر تھوک دیا۔ جناب علیؑ نے تلوار پھینک دی۔ پہلوان نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں تو اللہ کے لیے تلوار اٹھاتا ہوں، بندۂ حق ہوں بندۂ نفس نہیں ہوں، بلکہ میں تو خود ایک تیغ ہوں اللہ کے ہاتھ میں ؎

گفت من تیغ از پئے حق می زنم — بندۂ حقم نہ مامورِ تنم

گویا مجاہد تلوار چلاتا ہوا نظر آتا ہے لیکن مجاہد خود تلوار ہے اللہ کے ہاتھ میں۔ آج اسی مجاہد کا یومِ وفات ہے۔ اس مجاہد کا یومِ وفات ہے جس کی تمام تعلیم و تلقین الصلوٰۃ اور الجہاد تھی۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی اسی کلمہ کو دہرایا اور یہی وصیت کی۔ الصلوٰۃ اور

الجہاد، اور بے شک جس قوم نے صلوٰۃ اور جہاد کی حقیقت کو پالیا، اس کی قسمت یہ ہے کہ وہ "اعلون" سب سے غالب بن کر رہے۔

آج اس مجاہد کا یوم وفات ہے جس کی وفات کی خبر جب مدینہ میں پہونچی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بی بی بے حواسی کے عالم میں کہ نہ اس کو چادر کا ہوش، پاؤں کہیں اٹھتا ہے کہیں پڑتا ہے، روضۂ رسولؐ کی طرف جارہی ہے اور حضورؐ کی قبرِ مبارک کے سامنے کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے۔ "اے اللہ کے رسولؐ میں آج دنیا سے اُس شخص کے رخصت ہونے کی خبر سنانے آئی ہوں جو تجھے سب سے زیادہ عزیز تھا۔" یہ عظمہ اُمّ المومنین عائشہ تھیں۔ امّ المومنین عائشہ نے کہا "اب عرب کا شوہر اٹھ گیا، اب لوگ جو چاہیں کریں۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔"

اور بے شک اِس مردِ خدا کے بعد ہوا جو کچھ ہوا۔

جہادِ کربلا

(۱)

جہاد اور شہادت، زندگی اور موت کا اسلامی فلسفہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح عدمِ مدافعتِ شر نصرانیت کا اور اہنسا ہندومت کا فلسفہ ہے، یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں جسمانی طاقت کا اکثر غلط استعمال ہوا ہے، اسی تجربہ پر مبنی عدمِ مدافعتِ شر اور اہنسا کی تعلیم جسمانی طاقت سے پیدا شدہ برائیوں کا حل روحانیت میں پناہ لینے کو بتاتی ہے۔ اسلام جسم اور روح کے اس تضاد کو غیر معتبر سمجھتا ہے اور انسان کا فرض عین یہ قرار دیتا ہے کہ وہ تمام جسمانی اور روحانی طاقتوں سے شر کو مثبت انداز میں دُور کرے، اپنے نفس اور ماحول کی تطہیر کرے اور خیر کو فروغ دے۔

(۲)

جدوجہد زندگی کا خاصہ ہے، انسانی زندگی کا مقام اسلام یہ بتاتا ہے کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اس کو انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے اور خود انسان کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، یہی مقامِ شرف انسانی زندگی کی جدوجہد کی سمت اور مقصد متعین کرتا ہے۔ اب اگر انسان اپنے سے پست چیزوں کی طرف جھکتا ہے تو وہ بجائے عروج کے تنزل کی طرف جاتا ہے۔ اپنے سے پست چیزوں کی طرف مائل ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی پرستش کرے۔ انسان کی واماندگیوں اور محرومیوں کی دلدوز داستان میں یہ ایک عبرتناک حقیقت ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ ایسی شئے نہیں ہے کہ کسی نہ کسی زمانہ میں کسی نہ کسی قوم کی معبود نہ رہ چکی ہو۔ اصنام پرستی کی اسلام اس لیے مخالفت کرتا ہے کہ اصنام پرستی انسان کو اس کے شرف سے محروم کر دیتی ہے، اور ضلالت میں سرگرداں کرتی ہے، اپنے سے پست چیزوں کی طرف مائل ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان ان ہی چیزوں کے حصول کو جن کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ حیاتِ دنیا کہا ہے اپنا مقصدِ حیات بنالے۔ یہ ہوا و ہوس کے اور دنیوی دولت و

طاقت کے بتوں کی پرستش ہے۔ انسانی جدوجہد کی صحیح سمت اور صحیح مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو اور ان صلاحیتوں اور توانائیوں سے وہ جو کچھ کائنات سے حاصل کرتا ہے اس کو ان قدروں کو قائم کرنے میں صرف کردے جو اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی ہیں۔ اور اجمالاً وہ قدریں ہیں۔ انسانی حریت و مساوات جو عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضہ ہیں اور آپس میں عدل و احسان۔ تاکہ انسان کو بھوک سے سیری ہو اور وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو کر مقامِ امن تک پہنچے، اور بجائے حصولِ دولت و طاقت کے نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرے اور انسانیت کے لیے لامتناہی مادی اور اخلاقی اور روحانی ترقی کی منازل کو سبک رفتاری سے طے کرنا ممکن ہو جائے۔

اس اعلائے حق کی خاطر زندہ رہنے کو جہاد اور اس کی خاطر مرنے کو شہادت کہتے ہیں۔ جہاد کے بغیر زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے اور شہادت میں جینے اور مرنے کا تضاد ہی مٹ جاتا ہے۔ ع

"ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی"

(۳)

اپنے نفس کو تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں اور برائیوں سے پاک کرنے کو جن کو قرآنی اصطلاح میں "ذنب" اور "سیئات" کہا گیا ہے، جہادِ اکبر کہتے ہیں۔ ارادے اور نیت کی تطہیر یہ ہے کہ دل ہر قسم کے حسد و بغض اور نفرت اور غصہ سے پاک ہو اور اس میں دولت یا طاقت یا حکومت یا شہرت کی حرص کا شائبہ نہ ہو۔ نہ کسی دنیاوی طاقت کا خوف ہو نہ کسی دنیوی فائدہ کی طمع ہو۔ اس کا مقصد بحیثیت مسلم اپنا فرض پورا کر کے رضائے خداوندی حاصل کرنا ہے۔ جنت رضائے خداوندی سے حاصل ہوتی ہے، بلکہ رضائے خداوندی کا نام ہی جنت ہے۔ اور اس کی تمثیل زندگی کی ایسی کیفیت ہے جیسے کھلے ہوئے باغ ہوں جن کی آبیاری رحمتِ خداوندی کی بہتی ہوئی نہروں سے ہو رہی ہے، اور یہ کیفیت دائمی ہو۔ اس اجر کے علاوہ اس کے پیشِ نظر اور کوئی اجر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ اپنی تمام خوف اور امیدوں کو انسان اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ کرے، یہ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرنا خود ایک بے پناہ

طاقت کا راز ہے، یہ جہادِ اکبر ہے۔

اور پھر جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہوں، انسانوں پر ظلم و جبر ڈھاتے ہوں، انسانی جان اور مال اور ننگ و ناموس اور اللہ کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے ہوں اور انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور زبان کو مقید کیے ہوئے ہوں۔ ان سے قتال کرنا جہادِ اصغر ہے۔

حضورؐ کی مکی زندگی بھی جہاد تھی اور مدنی زندگی بھی جہاد تھی۔

جہادِ اکبر یعنی تزکیۂ نفس کے بغیر نفسانیت انسان پر غالب ہوتی ہے، اور اس کا قتال فساد کا باعث ہوتا ہے، اگر ایک طرف تزکیۂ نفس کے بغیر قتال جہاد نہیں بنتا تو دوسری طرف جہاد خود تزکیۂ نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کی رہبانیت جہاد ہے۔ ؎

مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

(۴)

جہاد امن کا منافی نہیں ہے، بلکہ امن قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے، اسلام میں امن کے معنی وہ حالت نہیں ہے جہاں جنگ نہ ہو بلکہ وہ حالت ہے جہاں خوف نہ ہو۔ خوف دُور ہونے کی یہ شرط نہیں ہے کہ ایک قوم بہت دولت اور قوت کی مالک ہو، دیکھو کہ جو قومیں بے اندازہ دولت اور قوت کی مالک ہیں وہ کس کس طرح کے خوف کے ماحول میں مقید ہیں، خوف دُور ہونے کی شرط محض یہ ہے کہ عدل قائم ہو، جہاں جہاں اور جس حد تک عدل قائم ہوگا خوف دور رہے گا۔ جہاں عدل قائم نہیں خوف موجود ہے اور امن مفقود۔ جہاد تو ہوتا ہی قیامِ عدل کے لیے ہے جس کے بغیر امن ناممکن ہے۔ جہاد کی متضاد کیفیت کو امن نہیں کہتے بلکہ فساد کہتے ہیں۔

جہاد حقیقت میں ایک بندہ یا قوم کا اپنے اللہ سے ایک معاملہ اور سودا ہے، اللہ تعالیٰ مومنوں سے ان کے نفوس اور ان کے مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض ان کو جنّت دیتا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بقدرِ استطاعت جہاد کی تیاری کا حکم دیا ہے یعنی ہمارے مادی اور روحانی

وسائل کی حد تک" میں تو اصلاح کا ارادہ کر چکا ہوں بقدرِ استطاعت " بقدرِ استطاعت سامانِ جہاد تیار کرو"۔ جس قوم کے اندر جہاد کی روح موجود ہو اور جس نے بقدرِ استطاعت جہاد کی تیاری کر لی، اس کو بشارت ہو کہ اسے کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی کثیر ہو اور اس کے پاس کتنی ہی طاقت ہو غلام بنا کر نہیں رکھ سکتی۔ یہ سود و زیاں کے اندیشہ سے برتر اللہ سے توکل کا سودا ہے اور اس سے بڑھ کر وعدے کو پورا کرنے والا اور معاملے میں کھرا اور کون ہے، باعزت زندگی یا باشرف موت دونوں اسی کی نعمتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ موت میں سے زندگی کا نکالنے والا ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے جہاد کا مقصد خود واضح فرمایا" اے لوگو! پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص ایسے بادشاہ کو دیکھے جو ظالم ہو، حلالِ خدا کو حرام اور حرامِ خدا کو حلال سمجھنے والا ہو، عہد و پیمانِ الٰہی کا توڑنے والا ہو، سنّتِ رسولؐ کا مخالف ہو، بندگانِ خدا سے ظلم و جور کا برتاؤ کرنے والا ہو، اور اسے دیکھنے کے بعد نہ تو قول سے اس کی مخالفت کرے نہ فعل سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ حق ہو گا کہ جو اس بادشاہ کا ٹھکانا ہو وہی اس کا بھی قرار دے۔ دیکھو! ان حاکموں نے شیطان کی اطاعت اپنے لیے لازم کر لی ہے، اور خدا کی اطاعت سے منحرف ہو چکے ہیں اور انھوں نے فساد پھیلایا، حدودِ الٰہی معطل کر دیئے، خراجِ سلطنت کو اپنا ذاتی مال قرار دیدیا، حرامِ خدا کو حلال اور حلالِ خدا کو حرام کیا، اور ان کے خلاف آواز بلند کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔"

بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ اس سے زیادہ بے سروسامانی کا تصور محال ہے۔ تعداد و وسائل کے لحاظ سے دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہی نہ تھا۔ پھر بھی امام حسینؑ نے صرف یہ نہیں کیا کہ بیعت سے انکار کیا بلکہ حق کے اصول کے اثبات و حمایت میں تمام وہ طاقتیں اور توانائیاں صرف کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دی تھیں، باطل کے مقابلے میں حق کو قائم کرنے کے لیے اپنے اور اپنے ساتھیوں، عزیزوں اور بچوں اور عورتوں کے لیے تین دن کی بھوک پیاس کو برداشت کیا۔ اپنے باوفا ساتھیوں کو ایک ایک کر کے قربان کیا، اپنے عزیزوں کو خدا کی بارگاہ میں نذر کیا، اور پھر اس عمر میں اس حالت میں وہ جہاد کیا جو تاریخ میں یادگار جہاد ہے۔ مقصد اللہ کی راہ میں تا حدِ استطاعت سعی کرنا تھا، ایک ایک ساتھی اور عزیز، گھر بار، عزت و ناموس، بچہ، بوڑھا،

جسم وجاں کی آخری توانائی ، خون کا آخری قطرہ ، جن جن دولتوں سے اللہ نے اپنے اس بندہ کو نوازا تھا، اس بندہ نے وہ تمام دولتیں اسی کی راہ میں صَرف کر دیں۔

اور اللہ نے اس سعی کا اجر بھی وہ دیا جو صرف وہی دے سکتا ہے۔ ہم تو اس اجر کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب یزید کی فوج اپنی کامیابی کے نشہ میں مخمور تھی اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے لاشے بے گور و کفن میدانِ کربلا میں پڑے ہوئے تھے، اور ان کے خیمے جل چکے تھے، اور عورتیں اور بچے اسیر ہو چکے تھے تو یہی بے گور و کفن لاشے فتحِ مبین کے نشان بن گئے اور وہ اصول جن کی خاطر امام حسینؑ نے جان دی اور جو کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں مضمر ہیں ہمیشہ کے لیے یزیدیت کی دست برد سے آزاد ہو گئے۔ ایک زبردست زندگی کی روایت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سنت قائم ہو گئی جو تمام اسلامی تاریخ میں سونے اور روشنی کی لکیر کی طرح تاباں ہے، اور جب کبھی ظلم کے خلاف آواز اٹھتی ہے اور اصلاح کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور حق کی خاطر آخری قربانی دینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے تو وہ اسلام کے سینہ میں حسینؑ ہی کے ضمیر کا اضطراب اور دل کی تڑپ محسوس ہوتی ہے، یہ اضطراب، یہ تڑپ، یہ تب و تاب اسلام کے سینہ میں محفوظ ہے اور جاوداں ہے، خدا ایسی موت کی تمنّا کو سدا زندہ اور بیدار رکھے کہ زندگی کا راز اسی تمنّا میں ہے۔ باقی سب چیزیں آنی جانی ہیں۔

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت　　سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　زندہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا، اے پیکِ دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

شبِ عاشور

امام حسینؑ صلح کی ہر اُس کوشش کے لیے آمادہ تھے جس میں اسلام کے اصول اور قدریں مجروح نہ ہوں۔ یزید کی طرزِ زندگی سراسر اسلام کے اصول اور آئین کی توہین اور تردید اور تضحیک تھی۔ امام حسینؑ اگر بیعتِ کر لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس چیلنج کے مقابلہ میں جو یزید نے اسلام کو دیا تھا امام حسینؑ سپر انداختہ ہو گئے اور کوئی ایسا نہ رہا جو اسلام کی حمایت اور نصرت میں صدائے احتجاج بلند کرے۔ امام حسینؑ اس بات کے لیے بھی تیار تھے کہ جنگ کو ٹالنے کی خاطر وہ ترکِ وطن اختیار کریں۔ جس وقت یہ شرائط لشکرِ یزید کے سپہ سالار عمرِ سعد نے حاکمِ کوفہ عبید اللہ ابنِ زیاد کے پاس بھیجیں تو اس کو یہ گمان تھا کہ شاید نوبت جنگ تک نہ پہونچے۔ لیکن زعمِ باطل میں مغرور مادّی طاقت کا پرستار ظالم مردِ حق کی طرف سے صلح کی ہر کوشش کو اس کی کمزوری پر محمول کرتا ہے اور اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ عبید اللہ بن زیاد نے جواباً عمرِ سعد کو حکم دیا کہ وہ بغیر کسی گفت و شنید کے امام حسینؑ سے بیعت لے اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان کو قتل کرے اور ان کی لاش کو گھوڑوں سے پامال کرے، اور بصورت عدمِ تعمیل حکم خود کو معزول سمجھے۔ یہ حکمنامہ لے کر شمر ۹ محرم کو میدانِ کربلا میں پہنچا۔ اس حکم کی فوری حرف بحرف تعمیل کی نگرانی بھی اس کے سپرد تھی۔

امامؑ عالی مقام کی طرف سے حجت تمام ہو چکی۔ جنگ ۹ محرم کی شام کو ہی شروع ہونے والی تھی کہ امامؑ عالی مقام نے خاص طور پر ایک رات کی مہلت طلب کی جو منظور کر لی گئی۔ جب شام کا اندھیرا پھیلا تو آپ نے اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو جمع کیا اور حمد و تشکر کے بعد ان کے ایثار اور وفاداری پر ان کو جزائے خیر کی دعا دی اور فرمایا "آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جہاں تمھارا دل چاہے چلے جاؤ، میں بیعت کی ذمہ داری تم سے ہٹاتا ہوں۔ رات کا پردہ پڑا چاہتا ہے، اسی کو اپنا مرکب بنا کر روانہ ہو جاؤ بلکہ ہر ایک تم میں سے میرے عزیزوں میں سے بھی ایک ایک شخص کا ہاتھ پکڑے اور اپنے ساتھ لیتا

جائے۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں۔ اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔" یہ تقریر سنتے ہی آپ کے اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہؓ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا "ہم آپ کو چھوڑ دیں گے؟ حالانکہ اب تک آپ کا حق تو ہم ادا ہی نہ کر سکے۔ واللہ نہیں، ہرگز نہیں، میں اپنا نیزہ دشمنوں کے سینہ میں توڑوں گا۔ جب تک قبضہ ہاتھ میں رہے تلوار چلاتا رہوں گا، نہتا ہو جاؤں گا تو پتھر پھینکوں گا۔ یہاں تک کہ موت میرا خاتمہ کر دے۔" زہیر قینؓ نے کہا "اے فرزندِ رسولِ خدا! خدا آپ کے ساتھ ہو ہم نے آپ کی تقریر سنی۔ واللہ اگر دنیا ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہو اور ہم سدا اس میں رہنے والے ہوں جب بھی آپ کی حمایت و نصرت میں اس کی جدائی گوارا کر لیں گے اور ہمیشہ کی زندگی پر آپ کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیں گے۔" دوسرے اصحاب نے بھی اسی معنی کے جواب دیئے۔ اعزا میں سے جنابِ عباسؑ نے فرمایا "خدا ہم کو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ کرے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں"۔ امامؑ نے اپنے اعزا اور اصحاب کو دعائے خیر دی اور خیمے میں تشریف لے گئے۔

جب امامؑ عالی مقام نے مکہ سے کوفہ کی جانب کوچ کیا تھا تو ایک مجمع کثیر آپ کے ساتھ تھا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ امام حسینؑ ملک فتح کرنے جا رہے ہیں اور بہت مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا جس میں شریک ہوں گے۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ امام حسینؑ اسلام کو بچانے کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ ہر منزل پر ان لوگوں کو ساتھ چھوڑنے اور واپس ہونے کی تاکید کرتے آ رہے تھے۔ ہر منزل پر لوگ رخصت ہو رہے تھے یہاں تک کہ کربلا پہنچتے پہنچتے گنتی کے چند افراد آپ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ اس لیے کہ جس مقصد کے لیے آپ تشریف لیجا رہے تھے اس کے لیے آپ کو کثرتِ تعداد کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کارِ عظیم میں جیسا کہ آپ نے مکہ سے چلتے وقت فرمایا "جو شخص اپنی جان اسلام کی خاطر قربان کرنے کی ہمت رکھتا ہو جس میں لقائے الٰہی کا شوق ہو وہ کمر باندھے اور ہمارے ساتھ چلے۔ کل صبح ہم کوچ کر رہے ہیں، انشاء اللہ۔"

اور اب معیتِ الٰہی اور حق الیقین کی وہ منزل آ گئی تھی جس میں آپ کو یہ علم ہو چکا تھا کہ اگر دنیا میں آپ کا کوئی ساتھ نہ دے بلکہ اگر ساری دنیا مخالف بھی ہو جائے تو مشیّتِ الٰہی کا تقاضہ محض آپ کے جان دینے سے پورا ہو جائے گا۔ اگر کوئی ساتھ دیتا ہے تو یہ اس کی سعادت ہے۔

ضرورت نہیں۔

اب لشکرِ یزید میں دو خیموں کا منظر دیکھئے۔ ایک خیمہ میں عمر بن سعد بیٹھا ہوا ہے اور کچھ شعر پڑھ رہا ہے۔ جن کا مطلب ہے۔ "خدا کی قسم میں متفکر اور متامل ہوں اور کچھ نہیں جانتا ہوں دو بڑے امور ہیں، آیا ملک رے کو ترک کر دوں اور اپنی تمنا کو چھوڑ دوں یا حسینؑ کو قتل کرنے کا گنہگار بنوں۔ پس اگر انھوں نے سچ کہا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ توبہ قبول ہو جاتی ہے تو میں خدا سے توبہ کر لوں گا۔ اگرچہ یہ بہت بڑی توبہ ہوگی۔ اور اگر وہ جھوٹے ہیں پس میں دنیائے دنی میں کامیاب رہا اور ملک عظیم ہے، وہ کسی کا پاس و لحاظ نہیں کرتا۔ خبردار ہو کہ دنیا ایک خوبی معجل ہے، اور کوئی عاقل ایسا نہیں ہے جو نقد کو قرض کے عوض فروخت کرے دوسرے دنیا میں جو کچھ بھگتنا ہوگا بھگت لوں گا لیکن پھر پروردگار میری اس خطا کو بخش دے گا۔ اگرچہ میں کل جن و انس میں سب سے زیادہ گنہگار اور خطا کار ہی کیوں نہ ہوں"۔ یہی وہ شخص ہے جو کل صبح یزید سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے سب لشکر کو گواہ بنا کر سب سے پہلا تیر امام حسینؑ کے قلیل لشکر کی طرف پھینکے گا۔ ایک دوسرے خیمہ میں حُر ہے جو انتہائی بے چینی کے عالم میں اپنے خیمہ میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا ہے۔ سوچتا ہے کہ اُس نے سب سے پہلے امام حسینؑ کے گھوڑے کی لگام پر ہاتھ ڈال کر ان کو روکا تھا۔ وہ منظر اس کے سامنے ہے کہ جب امام حسینؑ نے پیاس سے مرتے ہوئے اس کے لشکر کے سواروں اور جانوروں کو پانی سے سیراب کیا تھا، امام حسینؑ کے خطبات کا ایک ایک لفظ اس کے دل و دماغ میں آگ لگائے ہوئے ہے کہ آخر امام حسینؑ کو کس جرم میں قتل کیا جا رہا ہے۔ امام حسینؑ کی معصومیت اور عظمت کا نقش اس کے دل میں گہرا اترتا جاتا ہے۔ اب دیکھتا ہے کہ تین دن سے ان کے بچے پیاس سے بلک رہے ہیں اور جنت اور دوزخ اور دنیا طلبی اور رضائے الٰہی کا فرق واضح کرنے والی جنگ کل صبح ناگزیر ہے اور بالآخر وہ فیصلہ کرتا ہے۔ حُر جس نے پیشِ خدا انسانیت کی لاج رکھ لی۔ یہی وہ شخص ہے جو کل صبح سب سے پہلے امام حسینؑ کے لشکر میں شامل ہو کر شہیدوں کے دستہ کا ہراول بنے گا۔ یہ "فیضلُّ اللّٰہُ من یشاءُ ویھدی من یشاء" کی عملی تفسیر ہے۔"

امام حسینؑ نے اس شب کی مہلت اس لیے لی تھی کہ "آج رات بھر ہم عبادتِ الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کریں، اللہ ہی واقف ہے کہ میں اس کی نماز و عبادت، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار سے کتنی محبت رکھتا ہوں"۔

یہ رات خیامِ حسینی میں کس طرح بسر ہوئی؟ بچوں کا تین دن کی بھوک اور پیاس سے کیا حال ہوگا۔ ان بیبیوں پر کیا گذری ہوگی جن کو معلوم تھا کہ ان کی گود کے پالے اور زندگی کے سہارے کل صبح ان کو دشمنوں کے نرغہ میں بے یار و مددگار چھوڑ کر رخصت ہوں گے، اور زخموں سے چور، خون میں نہائے ہوئے، بے گور و کفن جنگل میں بستی بسائیں گے۔ اصحابِ حسینؑ رات بھر خیموں کا پہرہ دیتے رہے، اور لکھا ہے کہ رات بھر توبہ و استغفار کی آوازیں ان خیموں سے اس طرح آتی رہیں جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ یہ جہادِ راہِ خدا کی تیاری تھی، اور اس مالکِ نفسِ مطمئنہ عبدِ خدا میں اور اس کے معبود میں کیا گفتگو ہوئی، کیا راز و نیاز ہوا، کیا دعائیں زمین سے عرش تک گئیں، کیا رحمتیں عرش سے زمین پر نازل ہوئیں، یہ تو حسینؑ جانے یا حسینؑ کا خدا۔ سجدوں میں عشق کی مہم سر ہوئی، رات ختم ہوئی، ہم شبیہ پیغمبر علی اکبرؑ نے اذان دی، نمازِ جماعت ادا کی گئی، اور امام حسینؑ نے دعا کی "الٰہی ہر مصیبت میں تو ہی میرا بھروسہ ہے، ہر سختی میں تو ہی پشت پناہ ہے۔ کتنی مصیبتیں پڑیں کہ دل کمزور ہوگیا۔ تدبیر نے جواب دے دیا، دوست نے بے وفائی کی، دشمن نے خوشیاں منائیں لیکن میں نے صرف تجھی سے التجا کی، اور تو نے ہی میری دستگیری کی، تو ہی ہر نعمت کا مالک ہے، تو ہی احسان والا ہے۔ آج بھی یہ بندۂ عاجز تجھی سے التجا کرتا ہے"۔

اور پھر جنگ کی تیاری شروع ہوگئی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

آپ کا نام جعفر، کنیت ابو عبداللہ اور لقب صادق تھا۔ آپ کے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ ابن امام علی زین العابدینؑ ابنِ سید الشہداء امام حسینؑ ابن حضرت علیؑ تھے۔ آپ کی والدہ کا اسمِ گرامی اُمِّ فروہ تھا جو جناب قاسم ابنِ حضرت محمد ابن حضرت ابوبکر کی صاحبزادی تھیں۔ آپ خانوادۂ رسالت کے چھٹے امام ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ کو مدینۂ منورہ میں ہوئی۔ بارہ سال اپنے جدِ بزرگوار امام زین العابدینؑ اور انیس سال اپنے والدِ بزرگوار حضرت امام محمد باقرؑ کے زیرِ سایہ پرورش و تربیت پائی اور ۱۱۴ھ میں آپ خود منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔

اس وقت ہشام بن عبدالملک خلیفۂ اموی کا دورِ حکومت تھا۔ آپ کی وفات ۶۵ سال کی عمر میں ۵ شوال ۱۴۸ھ کو مدینۂ منورہ میں ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ اس وقت ابوجعفر المنصور عباسی خلیفہ کا دورِ حکومت تھا۔

ہشام بن عبدالملک کے دورِ حکومت سے عباسی خلیفہ منصور کے دور تک کا زمانہ بہت افراتفری اور کشت و خون کا زمانہ تھا، اموی حکومت کے اقتدار و استحکام کا عہد ختم ہو چکا تھا اور جبر و استبداد کے ردِّ عمل کے طور پر بے چینی کی لہر عام ہوتی جا رہی تھی۔ خانوادۂ رسالت پر جو مسلسل ظلم ڈھائے گئے تھے ان کے نتیجے میں غم و غصہ کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا اور اموی عرب سامراجیت میں عجمی مسلمانوں کی حالت تباہ تھی۔ بنو عباس نے اس اضطرابی اور ہیجانی کیفیت سے فائدہ اٹھایا اور امام حسینؑ کے خونِ ناحق کے انتقام اور اہلبیتِ رسولؐ کی نصرت کے نام پر اور عجمی مسلمانوں کی مکمل تائید و تعاون سے بنو امیہ کے خلاف اموی سلطنت کے وسیع حصوں میں سازش کا جال پھیلایا، بالآخر یہ سازش انقلاب بن کر ابھری اور کشت و خون کی بہت سی منزلیں طے کر کے عباسی خلافت کے قیام کی صورت میں کامیاب ہوئی۔

امام جعفر صادقؑ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی اس کی تمام روشنی ذکرِ الٰہی کے نور اور

غمِ حسینؑ کے چراغوں سے تھی۔ خود آپ کی زندگی میں دو واقعات خانوادۂ رسالتؐ پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ ایک تو ۱۲۰ ہجری میں ہشام کے دورِ حکومت میں آپ کے عمِ نامدار جناب زید بن علیؑ کا خروج۔ زیدؑ عبادت اور زہد و تقویٰ اور علم میں اپنی خاندانی روایت کا بہترین نمونہ تھے۔ ان ہی زید کی لاش ایک سال سے زیادہ عرصہ تک درِ کوفہ کی زینت بنی رہی، اور دوسرے سال ان کے بیٹے یحییٰ بن زید بھی شہید کر دیئے گئے۔ عباسی انقلاب بنی فاطمہ کے انتقام کے نام پر کامیاب ہوا تھا۔ چنانچہ شاہی مصلحت کا یہ فرض ہوا کہ عباسی خلیفہ بنی فاطمہ کے نام کو مٹانے میں سرگرم ہوں۔ امام جعفر صادقؑ نے مدینہ سے امام حسنؑ کی تمام اولاد کو طوق و زنجیر میں گرفتار ہو کر دار الخلافت کی طرف ہجرت کرتے ہوئے دیکھا اور وہ خونیں ماجرا بھی دیکھا جو محمد نفسِ ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کے ساتھ گذرا۔

خود جناب امام جعفر صادقؑ کی نظر میں اس واقعہ کی جس کو عباسی انقلاب کہا جاتا ہے اور جس کی سرخیٔ مضمون کے لیے لاتعداد انسانوں کا خون صرف ہوا، اس سے زیادہ حیثیت نہ تھی کہ ایک فتنہ نے دوسرے فتنہ کی جگہ لے لی۔ عباسی انقلاب تو برپا ہی اس نعرہ پر ہوا تھا کہ ظالموں سے اس گھرانے کے خون کا حساب لیا جائے جس کے چشم و چراغ اس زمانہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے، اور وہ موقعہ بھی آیا جب ابو سلمہ نے جو عراق میں عباسی دعوت اور تحریک کا مطلق کرتا دھرتا تھا، مدینہ میں امام جعفر صادقؑ کے پاس تختِ خلافت کے لیے دعوت نامہ بھیجا۔ امام جعفر صادقؑ نے چراغ کی روشنی میں اس خط کو پڑھا اور اسی شعلہ سے خط کو جلا کر قاصد کی طرف مخاطب ہوئے کہ یہی خط کا جواب ہے۔ منصور کے دل میں جناب جعفر صادقؑ کی طرف سے خطرات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اس کیلئے یہی بات کافی تھی کہ وہ وجودِ مقدس جو خود اسی کی دعوتِ انقلاب کے مطابق تختِ خلافت کا حقدار ہے۔ دار الخلافہ سے دور مدینہ میں نہ صرف موجود ہے بلکہ مرجعِ خاص و عام ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ آپ اس کی نگرانی سے دور نہ رہیں اور کچھ موقعے لوگوں کی نگاہوں میں آپ کی تخفیف و تحقیر کے پیدا کیے جائیں بلکہ کوئی جواز ہاتھ آئے کہ اس خطرہ کو جو آپ کے دم کے ساتھ وابستہ ہے دور کیا جائے۔ چنانچہ آپ کو کم از کم دو مرتبہ اور بقولے چھ مرتبہ مدینہ سے کوفہ اور پھر بغداد آنے کی زحمت دی گئی۔

لیکن یہ نیکی اور معصومیت کا رعب وجلال ہے کہ آپ ہر مرتبہ عزت اور توقیر سے واپس کر دیئے گئے۔ ایسے شخص پر روبرو کوئی حملہ ممکن نہیں۔ اگر کوئی حیلہ کارگر ہو سکتا ہے تو وہ اپنا منہ چھپا کر ہی ممکن ہے۔ بہت اصرار پر آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے کبھی بلایا نہ جائے۔ میں جب چاہوں اپنے اختیار سے آؤں، اپنے اختیار سے جاؤں ـــــ یہ کہا اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

امام جعفر صادقؑ کا اور دیگر ائمہ اہلبیتؑ کا رویہ اپنے زمانے کے سیاسی حوادث سے متعلق کچھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے:۔

(۱) ظلم کا لازمی نتیجہ فساد ہے۔ زندگی کے جس شعبہ میں اور جس حد تک عدل مفقود ہے اسی درجہ کا ظلم موجود ہے۔ ظلم کے نتیجہ میں جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کو دبانے کیلئے طاقت کا استعمال ایک نقطۂ نگاہ سے ناگزیر ہے لیکن دوسرے نقطۂ نگاہ سے وہ ظلم بالائے ظلم ہے۔

(۲) ظلم کے خلاف احتجاج کی جو آواز اٹھائی جائے وہ ہماری ہمدردی کی مستحق ہے، کیونکہ ظلم کے خلاف احتجاج انسانی حق ہے جس کی خود اللہ تعالیٰ نے توثیق کی ہے۔

(۳) لیکن کوئی مثبت مقصد پیش نظر نہ ہونے سے ظلم کے خلاف احتجاج ایک انتقامی کارروائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اصلاح کی کوشش کی جگہ اقتدار کی ہوس لے لیتی ہے ـــــ اور ظلم کا دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔

اس لیے امام عالی مقام احتجاج کی تمام صورتوں سے انتہائی ہمدردی رکھتے ہوئے انتقامی کارروائیوں میں ملوث نہیں ہوئے، بلکہ آپ نے اپنی تمام تر توجہ ملتِ اسلامیہ کی علمی اور اخلاقی اور نظریاتی روایت کو مستحکم اور زندہ سے زندہ تر بنانے کی کوشش میں صرف کی۔ یہ روایت ملت کی ریڑھ کی ہڈی ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر یہ روایت زندہ ہے تو ملت زندہ ہے، اور بہت سی ہیجانی حرکات اور داخلی تصادم و انتشار اور کشمکش اور تناؤ کو سہار لیتی ہے۔ لیکن اگر علم و اخلاق کی روایت اور نظریاتی بنیاد کمزور ہو گئی تو پھر کوئی طاقت آزمائی ملت کو بچا نہیں سکتی۔

جناب امام جعفر صادقؑ کی حیاتِ مبارکہ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک طوفان برپا ہے اور ہر شخص اس میں مبتلا ہے لیکن ایک اللہ کا بندہ اس عالمگیر طوفان کو فرصت کا

وقت سمجھ کر غنیمت جانتا ہے اور انتہائی اطمینانِ قلب سے زندگی کے بیجوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ اور نئے زندگی کے بیج بکھیر رہا ہے کہ طوفان تو آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن زندگی کی بقاء اور بہار ان ہی بیجوں پر منحصر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی شخصیت تاریخی تناظر میں بہت مرکزی اور جامع نظر آتی ہے۔ آپ کا عہد نہ صرف تاریخی اعتبار سے ایک اہم موڑ ہے بلکہ اسلامی علوم کی تاریخ میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دنیا کے تمام علم و تہذیب کے مراکز بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی فکر پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ فارس اور خراسان مملکت اسلامیہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ یونانی تہذیب کے اکثر مراکز مملکت اسلامیہ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ ہند اور چین کے اکثر حکماء اور فضلا بلادِ اسلامیہ کا سفر کر رہے ہیں۔ مدینہ میں جناب امام جعفر صادقؑ کا درِ دولت ایک بہت اہم درسگاہ کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ اسلامی علوم جو جستہ جستہ پھیلے ہوئے ہیں اب مدوّن کیے جا رہے ہیں اور ان کو ایک مستقل شکل دی جا رہی ہے، اور اس فکری تحریک میں امام جعفر صادقؑ کی ایک مرکزی شخصیت ہے۔

جامعیت کے لحاظ سے اگر دیکھو تو اس درس گاہ میں تمھیں علوم کے مختلف شعبوں کی، حدیث، فقہ، کلام، تصوف اور علومِ عقلیہ مثلاً کیمیا اور طب کی آبیاری ہوتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں آپ کو امام ابوحنیفہ نظر آئیں گے جن کے متعلق علامہ شبلی سیرتِ نعمان میں لکھتے ہیں: "ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے امام باقرؑ کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ تمام علماء نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیضِ صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزندِ رشید حضرت جعفر صادقؑ کے فیضِ صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے۔" یہیں آپ کو مالک بن انس بھی نظر آئیں گے۔ اور ان دونوں حضرات کا فقہ میں جو مقام ہے اس کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

یہاں آپ کو داؤد طائی یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے کہ اے پسرِ رسولِ خداؐ مجھے نصیحت کر

کہ میرا دل سیاہ ہوگیا ہے"۔ اس دروازے پر سفیان ثوری آپ کو فریاد کرتے نظر آئیں گے کہ اے فرزندِ رسولؐ تو نے گوشہ نشینی کیوں اختیار کرلی۔ اس لیے کہ لوگ تیرے انفاس کے فیض و فوائد سے محروم ہو چلے ہیں"۔ یہاں آپ کو بایزید بسطامی نظر آئیں گے۔ واصل بن عطا جو معتزلہ کے بانی تھے وہ بھی اسی دروازے سے فیضیاب ہوئے۔

جابر بن حیّان طرطوسی جن سے اسلامی سائنس کی داغ بیل پڑی اپنے رسالوں میں جگہ جگہ لکھتے ہیں "میرے امام نے مجھ سے یہ کہا، مجھے یہ بات بتائی ... ..."۔

غرض وہ تمام علومِ عقلیہ اور علومِ نقلیہ جن سے اسلامی فکر و تہذیب عبارت ہے اس کا سرچشمہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذات میں نظر آئے گا۔

اشاعتِ علوم کے ساتھ ساتھ آپ مکارمِ اخلاق کا نمونہ تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے وکیل سے ارشاد فرمایا کہ غلّہ روز بروز مدینہ میں گراں ہوتا جارہا ہے ہمارے یہاں کس قدر غلّہ ہوگا۔ وکیل نے کہا "ہمیں اس قحط کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس غلّہ کا اتنا ذخیرہ ہے جو بہت دن کے لیے کافی ہوگا"۔ حضرت نے فرمایا "یہ تمام غلّہ فروخت کر ڈالو۔ اس کے بعد جو حال سب کا ہو وہی ہمارا ہو"۔ جب غلّہ فروخت ہوگیا تو فرمایا "اب خالص گیہوں کی روٹی نہ پکا کرے، بلکہ آدھے گیہوں اور آدھے جَو"۔

ایک مرتبہ آپ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے۔ بہت تھک گئے تھے اور پسینہ سے شرابور تھے۔ کسی شخص نے آپ سے آرام کرنے کے لیے کہا تو فرمایا "طلبِ معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف سہنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے"۔

بہت سے ارشادات آپ سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ ہم صرف دو ارشادات کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

جبر و اختیار کے مسئلہ پر فرمایا "انسان اپنے فعل میں مختار ہے لیکن اپنے اختیار میں مجبور ہے"۔ الہام اور استدلال، عقل اور وجدان کے تعلق پر فرمایا "الہام مقبول بندوں کے اوصاف میں سے ہے لیکن بغیر الہام کے استدلال کرنا راندۂ درگاہ بندوں کی علامت ہے"۔